دو تہائی
قنبر علی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دو تہائی

قنبر علی

نشاط پبلی کیشنز

DO TIHAI

Qumber Ali

نام کتاب : دوتہائی

افسانے

مصنف : قنبر علی

محمد قنبر علی خاں —— #۳ر بھیکن پور، بھاگلپور-812001، بہار،

رابطہ: 0641-2302632

تعداد : ایک ہزار

سال : ۲۰۰۶ء

قیمت : ایک سو پچاس روپے (Rs. 150/-)

کمپوزنگ : اکرم فہمید زیتی — شہامت حسین لین، برہ پورہ، بھاگلپور-812001

سرورق : سرفراز اختر

مطبع : کراؤن آفسٹ پریس، سبزی باغ، پٹنہ-۴

ناشر : نشاط پبلی کیشن

NISHAT PUBLICATION

301, Grand Apartment, New Patliputra Colony,

Patna - 800013, Ph:-0612-2261045

مصنف کی دوسری کتابیں

☆ قوسین کے درمیاں (تنقید)

ترتیب وتزئین

☆ اگر نامہ بر ملے (مجموعہ خطوط)

مشاہیر بنام منظر علی خان

منظر علی خاں بنام مشاہیر

☆ ندی ——— تجزیاتی مطالعہ

زیر طبع

☆ بے ننگ و نام ——— شعری مجموعہ

☆ طاق نسیاں ——— انشائیے

☆ بجو کا اردو افسانوں میں

☆ پاکستانی چنندہ غزلیں (ہندی)

☆ پاکستانی چنندہ نظمیں (ہندی)

ان عزیزوں اور بزرگوں کے نام

جن سے ملنے کی تمنائیں دل میں ہمہ وقت مچلتی ہیں لیکن
ٹوبہ ٹیک سنگھ کی میّت کو لانگھنا، جان جوکھوں کا جھمیلا ہے۔

فہرست

دشتِ جاں کا حاشیہ 9

کلاکار 13

بجوکا 19

بابا 25

کھلا دروازہ 33

اس کا آدمی 49

مرگھٹ میں جگنو 55

پہلی اینٹ 61

کیکر کے پھول 67

راہ نجات 77

آتش بیگانہ 87

زخم شناسائی 99

دوتہائی 113

سلسلہ 121

از درختاں خزاں دیدہ نہ باشم کیں ہا
ناز برتازگی برگ و نوا نیز کنند

غالب

دشتِ جاں کا حاشیہ

افسانے، انسانی وجود سے وابستہ ہیں۔ روز و شب، گذشتہ سے پیوستہ کے تناظر میں کچھ نہ کچھ نیا، غیر متوقع، متحرک، ملفوف، انکہا، خوش رنگ اور جاذب و مکروہ ہو تو ذکر ہوتا ہے۔

میں یہ مانتا ہوں کہ افسانوں میں بھی تخیل کی کارفرمائی ناگزیر ہے مگر اسی حد تک کہ ذہن و دل پر بصیرت و بصارت اور انبساط و نمو کے شبنمی بدن کا گلا گھونٹنے والی دھند نہ پھیلائے، مضحکہ خیز نہ ہو جائے۔ مچھوارے کے جال میں ندی سے لالٹین تو نکل سکتی ہے مگر جلتی ہوئی لالٹین جادوگری کا حصّہ ہوگی، ادب کا نہیں۔ لکھنے کے لئے لکھنا منشی گری سے بھی بدتر ہے اور زندگی سے شناسائی کے بغیر کسی اِزم سے جُڑ کر لکھنا میرے خیال میں جرم ہے۔

اب تک میں نے کم افسانے لکھے، مگر جتنا کچھ کوندے کی طرح مکمل ذہن کے پردے پر اتر آیا ہے، جس کے پیچھے شعوری اور غیر شعوری اجزاء کے تضادات سے پاک مرکب، انفرادی اور اجتماعی وِژن، احتجاج اور محبت، پسندیدگی اور ناپسندی، حیاتیات کی نمو کے تقاضے، روایت کے مطالعے، خوابوں کے سفید وسیاہ، روشن امکانات کا فسوں، جذباتی تشنج کو رفع کرنے کے سامانوں .... سے مزین ومرتب تخلیقی عمل اپنا کام غیر محسوس طور پر کر گیا، اسی کو کاغذ پر دھوپ کا رنگ اور شبنم کی نمی دے کر لفظوں کے حصار میں باندھا ہے۔

میری رائے میں تخلیقی عمل تشکیک، مردنی اور خود فراموشی کی منزلوں سے گذر کر جہاں انکشاف، اظہار، تجسیم، الہام، ارتفاع اور وجود کے مخفی قوتوں کا مظہر ہے وہیں یہ کائنات اور ذات کے مابین رشتوں کو سمجھنے کا جمالیاتی وسیلہ بھی، جس کا ابلاغ، دوسروں کی شراکت کا تمنائی ہے۔ صیقل کرنے کے لئے ہمارے اندر کا قاری معاون رہا ہے۔ بھانمتی کا کنبہ جوڑنا مجھے ابھی تک نہیں آیا اور نہ توجہ دی ہے۔ گھڑی کی سوئی کو میرے نزدیک دس منٹ آگے بڑھا کر بھول جانا ممکن نہیں۔

جس قدر ہوسکتا ہے سبھوں کو پڑھتا ہوں مگر اب تک افسانوں کے نام پر جتنا کچھ لکھا، میرے پابہ زنجیر لمحوں میں پیدا ہونے والے آہنگ کا نقش ہے۔ میرا بیانیہ کمزور ہوسکتا ہے مگر اَنمل نہیں۔ میرا اسلوب پھیکا ہوسکتا ہے مگر مصنوعی نہیں۔

تخلیقیت کا جادو جگانے کے لئے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تشبیہ، استعارے، تلمیح، علامت، ابہام اور رعایتوں کو برتنے کی تگ ودو نہیں کر پاتا ہوں اور نہ تحیر واستعجاب کا غیر فطری اور بے محل استعمال دانستہ طور پر کیا ہے۔ نہ فکر واحساس کو لخت لخت رہنے دیا۔

افسانوں میں انفرادیت قائم کرنا مشکل ہے۔ یہ بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ پھر بھی کوئی افسانہ، دوسرے کا عکس نہیں اور نہ دو فنکاروں کے بیچ حد امتیاز بے معنی ٹھہرے گی۔ جب کہ وسعتِ نگاہ کی پہنائی میں سب کچھ ہماری ثقافت کی شعریات کا زائیدہ ہونے کے سبب سے ایک دوسرے کا حصہ بھی ہیں۔

میرا توسنِ خامہ افسانوں کے ساتھ ساتھ دیگر زمینوں میں بھی گرد اڑانے کی بساط بھر جستجو میں لگا رہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوا کہ راستہ یہی ہے اور کبھی یہ بھی محسوس ہوا کہ یہ تو شجر ممنوعہ کی ڈگر ہے۔

قنبر علی

۱۷/اپریل ۲۰۰۶ء

کلا کار

اکثر شام کو اس کے دروازے پر لوگ باگ جمع ہوتے، کاندھوں پر ریشمی بال سجائے نورانی چہرے پر ایک موٹے فریم کی عینک لگائے وہ جب اپنے کمرے سے نکلتا تو لوگوں میں خاموشی برس پڑتی، اور وہ اپنی مخصوص جگہ کی بجائے خاکساری کے ساتھ لوگوں میں ہی جگہ بنا کر بیٹھ جاتا۔ عبدل پھر اس کے حکم پر لوگوں میں چائے تقسیم کرتا وہ لوگوں کی باتیں سنتا، سر ہلاتا اور اس کی نگاہیں سب کے چہروں کی مایوسیوں پر مرہم کا کام کرتیں۔

سب کے ساتھ میں بھی جب اس دن اس کے روبرو بیٹھا تھا تو اس کی موجودگی نے مجھ پر بھی خاموشی برسائی تھی اور وہ کچھ سنانے پر آمادہ تھا اور سبھوں کے ساتھ میں نے بھی اس کی آواز پر جوں ہی اپنی مکمل سماعت کو اس کے حوالے کیا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

''آیئے۔ آیئے۔ میں تو آپ کی راہ دیکھ رہا تھا۔''

اور پھر اس نے سب سے معذرت کر لی اور اسکوٹر پر آئے ہوئے دو سفید پوش کو لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

مجھے ایک بار اس کے کمرے میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس کا یہ کمرہ جسے لوگ بیٹھک کہتے خاصا سجا سجایا کسی انگریزی بابو کا ڈرائنگ روم تھا۔ جس کی ہر شئے قیمتی تھی اور وہ وہاں بیٹھ کر بڑے بڑے سگریٹ اس رفتار سے پیتا جیسے اس نے آج کا دن سگریٹ پینے کے لئے ہی متعین کر رکھا ہو۔

اپنے دروازے پر ہی نہیں وہ تو اوروں کے دروازوں پر بھی جاتا اور بیٹھک کی زینت بنتا۔ لوگوں میں اس کی بڑی عزت ہے۔

اس کی عزت کیوں نہ ہو۔ وہ تو ہر دکھتے دل پر مرہم رکھتا، عوام سے قربت کا دم بھرتا اور بے بس و مجبور پر شفقت کی نگاہیں ڈالتا ہے۔ لوگ بھی اس کی اس بات سے بہت خوش ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ دکھ درد کا بوجھ دوسروں کو سنانے اور دوسروں سے کچھ سننے پر ہی تو کم ہوتا ہے۔

سماج میں اس کی عزت کا راز اس کے خیالات ہیں جسے وہ ایک ترتیب کے ساتھ انوکھے لہجے میں چست اور مناسب الفاظ کے سہارے لوگوں تک پہنچاتا ہے اور اس ترکیب کو لوگوں نے کہانی کا نام دے رکھا ہے۔

اس کی کہانیاں جاذب قلب ہیں وہ جب کہانیاں سناتا ہے تو لوگ اس کی خیالات پر آفریں کہتے ہیں۔

کہانیاں —— بیواؤں کی کہانیاں —— ان امپلائمنٹ کے مسئلے پر کہانیاں —— دکھ درد سے نجات پانے کے لئے خود آگہی کی کہانیاں —— اور استحصال پر کہانیاں ....

استحصال پر اس کی کہانیاں سن سن کر لوگوں نے تو دانتوں تلے انگلیاں دبا لیں۔ اس لئے کہ جس خطّے میں وہ رہتا ہے وہاں آئینہ دکھانے والوں کی کمی ہی نہیں آئینے کی بھی کمی ہے۔

لوگ کہتے ——

''کیا صاف گوئی ہے۔''

''کیا بیا کی ہے۔''

''سماج کی سچی تصویر تو بس انہوں نے اتاری۔''

لوگ کہتے ہیں جو بھی قصہ ہم لوگوں نے سنا بس خیالی، حقیقت سے جس کا واسطہ نہیں۔ اس لئے کہ استحصال پر لکھی اس کی کہانی بہت کامیاب ہے۔ اسے بھی اپنی اس کہانی پر ناز ہے جسے دور دراز تک کے لوگوں نے بھی پسند کیا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنے نام دور دراز سے آئے ہوئے تحسین آمیز خطوط بھی دکھاتا ہے۔

اس کی کہانی میں ——!

اس کی کہانی میں اس کا کردار استحصال کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی بھیڑ میں نمایاں ہو رہا ہے اور سامنے بند کمرے میں میٹنگ چل رہی ہے۔ پھر جب میٹنگ والوں نے سامنے بھیڑ سے ایک آدمی طلب کیا تو وہ میٹنگ ہال کے اندر داخل ہو گیا...... اور جب وہ باہر آیا تو اس کی آنکھوں میں ایک نشہ تھا اس کی آنکھیں کسی نے نہ دیکھیں اور اس نے لوگوں سے کہا۔

''بات ہو گئی ہے۔''

اور پھر لوگ اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔

وہ یہ قصہ جب بھی سناتا تو میں نے دیکھا ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک ہوتی۔ میں نے اس چمک کو کبھی تو یہ سمجھا کہ بے باک تجربے سے سچائی مسرّت بن کر آنکھوں سے پھوٹ رہی ہے اور کبھی تو میں اس کے متعلق سوچتے سوچتے الجھ جاتا۔ اس لئے کہ اس کا ایک اور روپ ہے جہاں وہ مسند نشیں ہے۔ اس دنیا میں اس کا بڑا رعب ہے اس لئے کہ راجہ نے اس کو مسند دی ہے۔ اس کے علاقہ میں جو بھی تعمیری یا تخریبی کام ہوتا ہے بغیر اس کی نگرانی کے نہیں ہوتا۔ یوں تو اس کے علاوہ بھی لوگ ہیں —— کچھ تو اس کے قد سے چھوٹے اور کچھ بڑے۔ وہ مناسب قد کا آدمی ہے جس کے لئے نگرانی کا مسئلہ بہت ہی سلجھا ہوا ہے اسے کبھی بھی ٹھکانے پر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ٹھکانے پر

اپنے سے چھوٹے قد والوں کو بھیج دیتا ہے اور جب راجہ کے یہاں بلاوا ہوتا ہے تو اس سے اونچے قد والے جواب دہ ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ مناسب جگہ پر بیٹھا اپنے علاقہ میں راجہ کی تجوری کا ایک وارث ہے لوگ اس کے علاقے میں جو بھی کام کرتے اس سے پوچھ کر کرتے۔ اس کی اجازت ضروری ہے اور اجازت کے لئے لوگ اس کے نزدیک سر ٹیک دیتے ہیں۔ لوگ جب بھی اس کے سامنے سر ٹیکتے ہیں ان کی قمیص کی جیب سے کچھ کھنکتے سکّے ڈھلک جاتے ہیں جو نذرانے کے طور پر اس وقت تک وہیں پڑے رہتے ہیں جب تک کہ وہ حکم لے کر چلے نہ جائیں کہ کہاں اور کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے؟

میں نے تو ایسا بھی دیکھا ہے کہ اگر کسی کی قمیص میں جیب نہیں ہوتی تو وہ اپنی مٹھی سے جیب کا کام لیتا اور جوں ہی وہ اپنے سر ٹیکتا ہے اس کی مٹھی کھل جاتی۔

آج ایک عرصہ کے بعد جب میں نے اس کے گھر کا رخ کیا تو زمین میرے قدموں سے لپٹ لپٹ گئی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ آج شام آسمان پر وہ رنگ کہیں نہیں تھا جواب سے پہلے میں نے دیکھا تھا۔ ہواؤں میں بھی وہ ترنم نہیں جس کے سُرور مجھے اس کی جانب بہلائے لئے چلتے۔

کتھاؤں کی جھولی ہاتھ میں لئے وہ لگتا تھا میرے انتظار میں تھا اور اس کے اردگرد تنہائی براجمان تھی۔ اور وہ اپنے اکیلے پن سے اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ میں جھک کر آداب بجالایا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور سگریٹ کا دھواں اس کے چاروں طرف بادل کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ جب ہی میں نے یہ اندازہ لگایا کہ لوگوں کے انتظار میں اس نے دو پیکٹ سگریٹ پھونک دیئے تھے۔

اس کا انتظار یخ بستہ موسم میں کوئل کی صدا کا منتظر لگ رہا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی کتھائیں سننے اب کوئی نہیں آتا اور میں نے اس کے گھر کا رخ کرتے ہوئے یہی سوچا تھا کہ اس سے مل کر یہ جانا جائے کہ ایسا کیسے ہوا۔ اس کی باتوں پر سر ہلانے والوں کی عدم موجودگی کا راز کیا ہے؟

اس نے میرا حال پوچھا——

''ٹھیک ہے۔''

میں نے اس کی خیریت دریافت کی۔

''ہاں ٹھیک ہی ہے۔''

''میں آج بہت دنوں بعد آیا ہوں۔ سوچا آپ سے ملوں بہت دنوں سے آپ کی کوئی کہانی نہیں سنی۔''

''اچھا اچھا۔''

''کیا کوئی نئی کہانی ہے؟''

''کیوں نہیں، کہانیاں تو میں لکھتا ہی رہتا ہوں۔ بلکہ مجھے یہ کہنا چاہئے کہ کہانیاں مجھے آ آ کر لکھنے پر آمادہ کرتی ہیں۔''

ابھی ہم لوگوں نے باتیں شروع ہی کی تھیں کہ ایک نوجوان جس کے گلے میں سونے کی چین اور ہاتھ میں ایک خوبصورت چرمی بیگ تھا قریب آ کر آداب بجالاتا ہے اور ایک بند لفافہ سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے لجاجت سے کہتا ہے:

''بھولا بابو نے بھیجا ہے۔''

''او—— اچھا آپ بھولا بابو کے آدمی ہیں۔ میں تو آپ کی راہ دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے چار بجے کا ٹائم دیا تھا۔''

''جی سر۔ وہ۔ وہ میں مٹیریل گروا رہا تھا۔ میرا وہاں رہنا بھی تو ضروری ہے نہ۔''

''اچھا۔ اچھا، ٹھیک ہے۔ اس میں کتنا کچھ ہے؟''

''پی۔ سی کی ساری......'' اس نے جلدی سے کہا۔

''ہاں بھائی میں دھندے کا پکا ہوں۔''

''اچھا سر میں چلتا ہوں۔ بھولا بابو سے کہہ دوں......''

''ہاں ہاں بھولا بابو سے کہہ دینا فنڈ کے آتے ہی میں باقی رقم کا چیک کاٹ دوں گا اور اس کام کا بل بھی جلدی دینا۔ پھر فنڈ اگر دوسری طرف لگ گیا تو پریشانی ہوگی مجھے بھولا بابو کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔''

''اچھا سر۔'' اس نے پھر اجازت لی۔

''ٹھیک ہے۔'' اور اس نے اپنی گردن ایک جانب جھکا دی۔

اور وہ چلا جاتا ہے۔

میں نے آج سب کچھ سمجھ لیا۔ اب کچھ دریافت کرنے کی ضرورت نہ تھی پھر بھی میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''سر اس پی۔سی کے بغیر کام نہیں ہوسکتا۔ آپ تو کتھا کار آدمی ہیں۔ ان ساری باتوں کے خلاف آوازیں بلند کرنے والے...... آپ کی کہانیاں ......

''ارے تم —— بھی —— تم بھی اوروں کی طرح نکلے۔ کہانیاں لکھنا تو ایک کلا ہے، فن ہے، آرٹ ہے۔ اور —— یہ —— اور یہ تو میرا کام ہے۔ تم پریکٹیکل آدمی نہیں۔''

لوٹنے کو تو میں گھر لوٹ آیا مگر ذہن اتنا لمبا راستہ عبور کرنے کے بعد بھی الجھا رہا۔ دن میں اکثر راستے بھٹک جاتا اور کئی راتیں بستر پر نیند کی دیوی کا انتظار کرتا رہا تھا مگر ذہن سوچوں میں الجھا رہا ——

کہانیاں!

فن، آرٹ، کلا!

کلاکار!

پریکٹیکل آدمی!

نیرنگ خیال - فروری ۱۹۸۹ء آنچل - اپریل ۱۹۸۹ء
راولپنڈی کراچی

بجوکا

پریم چند کی کہانی کا خمیدہ کمر ہوری ابھری ہوئی رگِ جاں کو مانند زنجیر بجاتا کھیلتا اپنے کنبے کے ساتھ سریندر پرکاش کے باب قصص میں داخل ہوا تو بجوکا گریباں گیر ہو گیا ....

مچان کے قریب آ کر وہ زور سے ہنسا۔

"ہاہاہا...... بڑا آیا...... حق نہیں دینے والا۔"

پھر اس نے مچان کی اولتی میں اپنی درانتی کھونس دی اور سنبھل سنبھل کر بانس کے کھمبے پر چڑھ کر ساکت ہو گیا۔

شام سے بستی میں گہرا سناٹا تھا۔ ہوری کے گھر اِکا دُکا لوگ سر جھکائے آ جا رہے تھے۔ ہوری کی دونوں بیوہ بہوئیں گریہ کرنا بھی بھول گئی تھیں اور اس کے پوتے پوتیاں سارے کے سارے بے سدھ تھے۔ دہلیز پر جلتی ہوئی ڈھبری کے دھوئیں کا وجود گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ دم توڑتی ہوئی روشنی، زندگی کے مفہوم کی تلاش میں تھکی تھکی سی محسوس ہو رہی تھی۔

لوگ آتے، سمجھاتے بجھاتے، تسلی دیتے اور چلے جاتے۔ پھر اچانک چار پانچ آدمی کے ایک ساتھ باتیں کرتے ہوئے آنے کے احساس نے ٹھوکا لگایا تو ہوری کا بڑا پوتا گجیندر سامنے آیا۔ کمرے کی دیوار سے لگی کھٹیا کو آنگن میں بچھاتے ہوئے وہ سرپنچ کے پاؤں چھو کر دہلیز پر دوبارہ اکڑوں بیٹھ گیا۔

جلتے ہوئے ڈھبری کے دھوئیں اور روشنی کا تناسب اچانک برابر برابر ہو گیا۔

سرپنچ چار پانچ آدمی کے ساتھ آیا تھا۔ یہ سارے لوگ اندر سے نادم اور شرمندہ لگ رہے تھے۔ جیسے کھیل ہی کھیل میں ان کے ہاتھوں کسی بچے کا غبارہ پھوٹ گیا ہو۔ بات شروع کرنے کے لئے سب ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے اور کبھی کبھی کوئی کھانس بھی دیتا۔ کچھ عمر کا تقاضا کچھ ذمہ داری کا احساس تھا کہ سرپنچ بول پڑا۔

''بیٹا گجیندر...... جو ہو گیا سو ہو گیا......''

اتنا کہہ کر سرپنچ اپنے اندر کچھ تلاش کرنے لگا۔ تب اس کے دائیں بازو بیٹھا بڑی بڑی مونچھوں والا اَدھک لال گویا ہوا۔

''ہم لوگ بھی کیا کر سکتے ...... چلو...... لیکن۔''

مونچھ والا آگے کچھ اور بولنے والا تھا کہ ایک اور آدمی گھر کے اندر بے دریغ داخل ہوا۔ دبلا پتلا، نشے میں دھت، لڑکھڑاتا ہوا۔

''کوئی بات نہیں ہے بیٹا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے۔''

اور پھر سرپنچ کے سامنے زمین پر ایک طرف دوزانو ہو گیا۔ اندھیرے سے جوجھتی ہوئی دم توڑتی روشنی میں، بس اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں، اس کے وجود کا احساس دلا رہی تھیں۔ ایک نظر ادھر ادھر دیکھ کر وہ پھر بول پڑا۔

''سرپنچ جی! پہچانا...... نہیں؟''

ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ تب جھرجھری لی۔

''سرپنچ —— پنچایت —— صاف۔''

اور اچانک اٹھ کر گھر کی چہار دیواری سے باہر نکل گیا۔ اک ذرار کا اس کے بعد چلتا بنا۔

گھر کے افراد ابھی چپ چپ تھے۔ آج صبح سے کسی نے ایک دانا تک منہ میں نہیں ڈالا تھا، نہ پانی ہی پیا تھا۔ اس گھر کی زندگی کے باب میں کسی نے ختم شد لکھ کر معنی کے چراغ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آنگن کے بیچوں بیچ لیٹا گھر کا کتا کریا گھنٹوں بے جان پڑا تھا۔ اب ساری باتوں کو اپنی آنکھوں میں ریکارڈ کرنے کے لئے ہر بولنے والے کی طرف منہ پھیرتا جاتا۔ دور کہیں دو چار کتوں کے ایک ساتھ بھونکنے کی آواز پر بھی خاموش ہی رہا۔

شام اب رات کا چولا بدل رہی تھی۔ سرپنچ اور اس کے ساتھیوں نے بھی دن کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ ان کو دکھ تھا تو اس بات کا کہ ''ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔'' مگر ایک امید تھی۔ گھر کے لوگ مان جائیں گے۔ آخر گاؤں ٹولے کی بات ہی تو ہے۔

سرپنچ نے گجیندر سے پھر کہنا شروع کیا......

''بیٹا گجیندر...... یہ تو انرتھ ہو جائے گا۔ دھرتی پھٹ جائے گی ......تم ہوری کو اس طرح بانس میں باندھ کر کب تک رکھو گے۔''

''نہیں سرپنچ بابو............ یہ میرے بابا کی وصیت ہے۔'' ہوری کی چھوٹی بہو نے آواز لگائی۔

''بہو......'' سرپنچ کے ساتھ اُدھک لال بولنے لگا۔

''مرنے والے کی ہر وصیت مانی جائے گی ...... پرنتو اس کے داہ سنسکار کے بعد......آدمی بجوکا کی جگہ بانس پر کب تک ٹنگا رہے گا......آخر کو سماج کی بھی تو کچھ......تم سب اس کے مرت شریر کو اس طرح......''

''ہاں۔ ہاں۔'' سرپنچ نے فیصلے کا تیور اپنایا۔ ''اس کے مرت شریر کو اس طرح بانس میں ٹانگ کر سڑنے گلنے اور چیل کوؤں کو کھانے نہیں دیا جائے گا...... یہ ادھرمیوں کا چلن ...... تم سب تیاری کرو۔ ہم پنچایت کی اور سے داہ سنسکار کا حکم دیتے ہیں۔''

گجیند ر سرپنچ کے قریب آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جیسے کوئی مینڈ آخر کو ٹوٹ گئی اور بہت سارا پانی اچانک میدانی علاقے میں اتر گیا ہو۔ ہوری کی دونوں بہوؤں نے بھی بین کرنا شروع کر دیا۔ آواز میں آواز ملاتے ہوئے سارے بچے رونے لگے۔ رونے کی آواز سناٹے میں اپنے اندر اس قدر درد لئے تھی کہ پنچایت کا کوئی بھی رکن کسی کو چپ کرانے کی ہمت نہ کر سکا۔ پھر اچانک سرپنچ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی رندھی رندھی آواز میں گجیندر نے کہا۔ ''کیا یہی انصاف ہے؟''

معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سرپنچ کے ساتھ آئے لوگوں میں ایک نے کہا۔ ''ہم تمہاری بھی شکایت سن سکتے ہیں...... دیکھو ایسا کبھی نہیں ہوا...... پہلے ہوری کا داہ سنسکار کرو...... بیچارہ۔''

ہوری کے گھر کے ساتھ ساتھ پنچایت کے بھی ممبران، محلے ٹولے کے بوڑھے بزرگ اور نوجوانوں نے مل کر ہوری کا داہ سنسکار کیا۔ امید سے زیادہ لوگوں نے شرکت کی۔ جمنا ندی کے تٹ پر مَردوں کے ساتھ گاؤں محلے کی عورتوں نے بھی بہوؤں کی موجودگی میں بھیگی بھیگی آنکھوں سے ہوری کو آخری بار دیکھا۔ پھر گجیندر نے ہوری کے منہ میں آگ ڈال دی۔ دھو دھو کر کے ہوری کی لاش جل کر خاک ہوگئی۔ لوگ باگ گم صم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

ہوری کی موت کے تیسرے دن گجیندر نے پنچایت کو عرضی دی کہ ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔ پنچایت نے فیصلے کے لئے چار دنوں کا وقت لیا۔ آنگن میں عورتوں اور باہر ہوری کے پوتوں کے ساتھ مردوں کی، صبح و شام بیٹھک کو دیکھ کر اندازہ ہونے لگا کہ زندگی کے آثار اپنا قدم جمانے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ لیکن......

فیصلے کے دن ہوری کے پانچوں پوتے پوتیاں صبح سے ہی تیاری کر رہے تھے۔ گجیندر نے اپنے دادا کی پگڑی کو سلیقے سے اپنے سر پر باندھا۔ ٹوٹے ہوئے آئینے کے بڑے ٹکڑے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ بہوؤں نے آس پڑوس کی دو تین عورتوں کو بھی ساتھ لیا۔ پنچایت

بھون پہنچے تو بچوں کو برآمدے میں پنچ کے بیچ بلا کر بیٹھایا گیا۔ عورتیں نیچے پنچایت بھون کی دہلیز سے ہٹ کر تماشبین عورتوں کے ساتھ منہ پر پلو کاڑھے کھڑی ہوگئیں۔ اتنے میں سرپنچ اپنی سائیکل سے آیا۔ اس کی سائیکل میں اسٹینڈ نہیں تھا۔ اس نے پنچایت بھون کی دیوار میں اپنی سائیکل ٹیڑھی کر کے لگادی۔ برآمدے پر چڑھا۔ پنچوں بیچ اس کے بیٹھنے کے لئے لوگوں نے جگہ بنائی۔ اس نے ایک نظر اِدھر اُدھر دیکھا۔ تقریباً سب لوگ آگئے تھے اور برآمدے کے ایک کونے میں بجوکا دیواروں کا سہارا لے کر کھڑا تھا۔

سرپنچ نے دوبارہ سبھوں کو ایک نظر دیکھا اور اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ یہ گجیندر کی عرضی تھی۔ پھر اس کو پڑھنا شروع کیا، جو پنچایت کے نام تھی......

جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں، بجوکا میرے دادا نے بنایا۔ اس کی قمیص میرے پردادا کو انگریز نے دی تھی اور اس کا ٹوپا بھی۔ اس کے سر پر استادہ ہانڈی میرے گھر کی ہے۔ یہ بے جان تھا مگر اس کا دعویٰ ہے کہ اس کے اندر جان ہے اور اس نے میرے کھیت کی حفاظت کے عوض میں فصل کا ایک چوتھائی حصہ اپنی مرضی سے کاٹ لیا۔ پنچایت نے بجوکا کے حق میں فیصلہ سنایا۔ اسی کے ویرودھ میں پریوار والوں کا خیال کرتے ہوئے میرے دادا ہوری نے اپنا پران تیاگ دیا اور آئندہ بجوکا نہ بنانے کی وصیت کرتے ہوئے خود کو بجوکا کی جگہ بانس پر کھڑا کرنے کا حکم دیا۔ ہم لوگوں نے دادا کی وصیت کا پالن کیا۔ پھر پنچایت کا حکم مانتے ہوئے ہم نے ان کا داہ سنسکار کر دیا اور اب پنچ کے سامنے اپنی درخواست لے کر حاضر ہیں کہ جب حق اور حصے کی بات چل پڑی ہے تو بجوکا سے، پنچایت، میرے دادا کی قمیص، ٹوپا اور ہانڈی واپس دلائے۔ یہ ہماری وراثت ہے۔ ہم اپنے پُرکھوں کی وراثت کا سودا نہیں کر سکتے!!

درخواست کے پیچھے اُنچل ادھیکاری کے کاریالیہ سے ملا آشرت پرمان پتر کا ادھ پنا بھی سرپنچ نے پنچ کے بیچ دکھاتے ہوئے رکھا۔ اس کے بعد سبھوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''ہم پنچوں نے گجیندر کی درخواست پر، جس کو ابھی سب کے سامنے پڑھ کر سنایا،

غور کرلیا ہے۔ گجیندر کی عرضی کی روشنی میں مدعا علیہ سے بھی صفائی مانگی گئی۔ مگر اس نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔ بلکہ اب تو یہ ہلتا ڈولتا بھی نہیں۔ کھلیان میں جھونپڑے کے قریب بانس پر ساکت تھا۔ اس کو تو پنچایت کے دو تین سدسیوں نے اٹھا کر یہاں لایا ہے۔ بجوکا کی خاموشی کو نصف اقرار مانتے ہوئے اور حالات کے پیش نظر، گجیندر کے دعوے پر ایسے میں پنچایت کا فیصلہ ہے کہ بجوکا کا ٹوپا اس کے جسم پر پڑی قمیص اور اس کے اوپر دھری ہانڈی جو ہوری کی تھی، اب اس کے پوتے گجیندر کے حوالے کی جاتی ہیں۔''

اتنا سننا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کچھ کی باچھیں کھل گئیں، بچوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیا اور عورتوں نے اپنی اپنی گردنیں پاس کھڑی عورتوں کے کاندھوں پر ڈال دیے۔ پھر بیچ سے ایک کرخت آواز نے سب کو خاموش کیا۔ سرپنچ نے دوبارہ اعلان کیا۔

''ہوری کے کھیت سے بجوکا نے اپنا حصہ جو فصل کا ایک چوتھائی لیا ہے وہ پنچایت بھون میں رہے گا جو آڑے وقتوں میں کام آئے گا۔ ویسے بجوکا جب چاہے اس کا اُپیوگ کر سکتا ہے کیونکہ یہ اس کی محنت کی کمائی ہے، اور پنچایت کے فیصلے کی مریادا کا بھی سوال ہے۔''

سرپنچ کے فیصلہ سنانے کے بعد لوگ باگ ادھر ادھر ہونے لگے۔ سبھوں کے چہرے پہ ہلکی ہلکی مسرّت تھی۔ ادھر ہوری کی بہوؤں نے خوش ہو کر اپنے اپنے بچوں کا منہ چوم لیا۔ برف کے پگھلنے کا احساس دلاتی ہوئی ٹھنڈی ہوا نے اپنے پروں کو کھولا۔ بجوکا سے واپس دلائی گئی قمیص، ٹوپا اور ہانڈی لے کر یہ لوگ شاہانہ چال سے گھر کی طرف چل پڑے۔

برسوں سے گاؤں میں اب تک سب امن چین ہے۔ پنچایت بھون میں پھر کوئی فیصلہ نہیں سنایا گیا، اور بھون کے برآمدے کے ایک کونے میں بانس کی دو کماچی اب بھی پڑی ہے۔

مباحثہ - مارچ-اپریل ۲۰۰۴ء

پٹنہ

بابا

نام تو اس کا ترلوچن پرشاد تھا۔ لیکن وہ اب ترلوچنا سے صرف لوچن ہو گیا تھا۔ خود بھی اب وہ اپنے آپ کو لوچن ہی کہتا اور لوگوں کو باتوں ہی باتوں میں اس کا یہ فقرہ ازبر ہو گیا تھا۔ ''پیر جی کی کرپا نہیں ہوتی تو یہ لوچن آپ لوگوں کی سیوا کیسے کرتا۔''

فساد میں کچہری کمپاؤنڈ کا مزار توڑ پھوڑ سے بچا رہا۔ اس کے عقیدت مندوں کی تعداد بھی بہت تھی۔ پر رحمت میاں، خاندانی مجاور فساد کے دوسرے دن ہی سے لاپتا ہو گئے تھے۔

یوں تو ریڈیو اسٹیشن کے باہر کے مزار کو شیو مندر میں تبدیل کرنے میں لوچن کا بڑا ہاتھ تھا۔ توڑ پھوڑ میں یہ سب سے آگے تھا۔ لیکن ہزار جتن کے بعد بھی شتاب ساختہ شیو مندر کی طرف لوگوں کو آکرشت نہ پا کر لوچن نے وہاں سے اپنا ڈیرہ ڈنڈا اٹھا لیا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن کے احاطے کے باہر مزار کے پاس اس کی پان کی دکان تھی جہاں دن بھر لوگ اڈا بازی تو خوب کرتے، پان کم کھاتے۔ یہاں کچہری کمپاؤنڈ کے مزار کے ٹھیک سامنے اس نے مٹھائی

کی ایک دکان کھولی اور پھر مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے اندر اگر کی بتیاں اور موم بتیوں کے علاوہ مزار پر عقیدت مندوں کے چڑھانے کے لئے طرح طرح کی خوش رنگ گوٹے پٹھے سے مزین چادریں بھی بنوا کر رکھ لیں تھیں۔ پھر ایک دن مزار سے قریب ہی رہنے کے لئے ایک جھونپڑا بھی ڈال لیا تھا۔ اس کی دکان چمک اٹھی تھی۔

کچہری کمپاؤنڈ سے متعلق اکثر ملازمین اپنی کوئی سی بھی کامیابی کے بعد مزار پر شیرینی چڑھانے نذر و نیاز کے لئے ضرور آتے۔ کسی کی فائل کہیں اٹکی ہو یا کسی کا پروموشن کہیں فائل میں پڑا پڑا کسی ٹیبل پر بے جان ہوگیا ہو یا مقدمے کی کارروائی حق میں ہو جائے۔ بلا مذہب وملت مزار پر عقیدت مند آتے۔ اپنے من کی مرادیں پاتے۔ اکثر شام کی فضا اگر کی بتیوں سے پر تقدس اور موم بتیوں کی روشنی مزار کی اطراف کو بُقعہ نور بنائے رکھتی۔ قرب و جوار کے فقیر بھی ہر صبح اپنا آسن بچھائے دیر گئے رات تک ہر آنے جانے والوں کو دعائیں دیتے اور عوض میں انہیں بھی بابا کے طفیل پیٹ بھر دانا پانی مل جاتا۔

روزانہ مزار پر نذر و نیاز کے سلسلے سے لوچن کو روٹی کپڑا میسر تھا تو جمعہ جمعرات کے دن کی وافر آمدنی سے وہ اپنی بیٹی کی بدائی کا خرچ مٹھی مٹھی جمع کر رہا تھا۔ اس کی اپنی ذات پر کوئی خرچ بھی نہیں تھا۔ کپڑے نہایت معمولی پہنتا۔ ادھر جمعہ جمعرات کو پہننے کے لئے اس نے دو جوڑے خان ڈریس سلوائے تھے۔ بیڑی پیتا نہیں تھا اور پان اس نے کبھی کھایا نہیں تھا۔ جس طرح مکر شنکرانتی کے بعد دن روز بروز ایک ایک تل بڑھتا جاتا ہے۔ لوچن کی بیٹی بھی روز بروز اپنے شباب کا سفر طے کرتی جا رہی تھی۔ لوچن کو البتہ اس کی فکر اب تک نہ ہوئی تھی۔ لیکن جب اسکوٹر مستری رام پرشاد مزار پر ہر جمعہ آنے جانے لگا اور اس نے اپنی بیٹی میں رام پرشاد کی دلچسپی کو کن انکھیوں سے دیکھ لیا تو جلد ہی بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کا خواب بننے لگا۔

لوچن کے گراہکوں میں کارپوریشن کے بڑا بابو اکھوری جی اس کے اچھے گراہک تھے جو اس کی گھریلو زندگی کی بھی گاہے گاہے خبر لیتے تھے اور لوچن کو ان کا سرپرست بننا اچھا لگا تھا۔ تبھی بیٹی کے لئے دھن جٹانے میں اکھوری بابو کے مشورے پر وہ سنجیدگی سے وچار کر سکا

تھا۔ ایک دن صبح ہی صبح لوچن اکھوری بابو کے گھر آ گیا۔ اکھوری بابو نے اسے کمرے میں بٹھایا۔ ابھی حال چال پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ لوچن بول پڑا۔ ''سرکار ہم نے دان دہیج میں بہت کچھ کرلیا پر اب اسکوٹر لینے کی بات پر وہ لوگ اڑ گئے ہیں۔'' لوچن کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں یکا یک ہلکے پسینے سے گڈمڈ ہونے لگیں۔

''اچھا۔ اسکوٹر کی مانگ کرنے لگا۔'' اکھوری بابو نے تعجب ظاہر کیا۔

''ہاں سرکار'' لوچن کھڑا ہوگیا۔ اکھوری بابو کی طرف ایک قدم بڑھا اور باتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''رام پرشاد کے گھر والے'' ...... ''اب آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں......'' وہ مطلب کی بات پر آتے آتے رک گیا۔ اچانک اپنی دھوتی کا ابھی ابھی کھلا ڈھیکا اڑسنے کے لئے وہ جھکا۔ اس بیچ اندر دروازے پر پڑا پردہ ہلکا سا ہلا اور ساتھ ہی اکھوری بابو کی بیوی کی آواز ابھری۔ ''سنتے ہیں۔ اندر آیئے ...... پہلے کون سے پونیہ نہیں کمائے جو اَب گھر لٹانے کا شوق ہے۔'' بیوی کی آواز میں تلخی تھی۔ اکھوری بابو کے چہرے پر لاعلمیت کی سفیدی پھیل گئی۔ انہوں نے جواب میں کچھ جاننا چاہا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟''

''کہوں گی کیا؟'' اندر سے آواز پھر ابھری۔ ''سب کو قرض دینے سے اچھا ہے کہ گھر ہی لٹا دیجئے۔ جس تس کو آئے دن پیسے دینا...... ہم کچھ نہیں جانتے ...... یہ سب مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

بیوی کی بات کو سمجھنے جاننے کے لئے اکھوری بابو گھر کے اندر تیزی سے داخل ہوئے جیسے کسی چیز کو ٹوٹ کر بکھرنے سے بچانا چاہتے ہوں۔ ان کی بیوی جلی بھنی تھی۔ قریب گئے تو اس ۔نے اپنا بھرپور غصہ جتایا۔

''اب کس آدمی کو قرض دے رہے ہیں۔ پہلے جس جس کو دیا، وہ تو وصول ہونے سے رہے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ لوگ سونا لے کر بھی مٹی نہیں دینے والے۔''

''کیا سب بکے جا رہی ہو؟'' اکھوری بابو نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ پھر معاملہ صاف کرنے کے لئے بولے۔ ''کہاں سے تم نے قرض کی بات نکالی۔ لوچن قرض کہاں مانگ رہا

ہے؟''

''کون لوچن؟''

''ارے وہی پیر بابا والا۔''

''تو پھر کیا لینے آیا ہے؟''

اب کے اکھوری بابو مسکرا بیٹھے اور فتح مندانہ انداز میں ایک قدم پیچھے ہٹے اور اپنی آواز میں کچھ وقار ڈال کر بولے۔

''وہ تو شکریہ کے دو بول کہنے آیا ہے۔''

''کیا پیسہ لوٹایا اس نے؟''

''اس نے کبھی قرض ہی کہاں لیا تھا۔''

''پھر شکریہ کس بات پر؟''

''ارے میں تو صرف مشورے دے دیتا ہوں ...... اس کی بیٹی کا بیاہ ہے نا۔ بیچارہ غریب آدمی ہے۔ اب شادی بیاہ تو ایک مصیبت ہے۔ غریب آدمی جب تک کچھ الگ سے ارجت نہیں کرتا۔ بچوں کی شادی اس کے لئے ایک خواب ہی ہوگا۔''

''اس کی بیٹی کی شادی میں آپ کیا کریں گے؟''

''میں کیا کروں گا۔ بس کچھ دھن حاصل کرنے کی ترکیب......''

''وہ کیسے؟'' ان کی بیوی بیچ میں بول پڑی۔

''روز کی دکانداری سے تو گھر بیچارہ چلا ہی رہا تھا۔ برہسپت اور شکر کو دکانداری کچھ اچھی ہو جاتی ہے تو گھر اس کا ٹھیک ٹھاک چل جاتا ہے، مگر بیٹی کی شادی کے لئے دھن......''

''وہ روز کی آمدنی سے دو پیسہ بچائے۔ اور کیا۔''

''دو پیسے بچانا کیا آسان ہے؟'' اکھوری بابو کے لہجہ میں تھوڑی سی تلخی ابھری۔

''تو پھر کسی کے گھر ڈاکہ ڈالے'' ...... ان کی بیوی کی آنکھوں میں محلے کی

بنیا گردھر کے بیٹا کی صورت ابھر آئی، جو باپ کے نام پر تین ہزار روپیہ لے کر گیا تو پلٹ کر نہ آیا۔ نہ اس کا اتا پتہ چلا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے دوست سارنگی ماسٹر کے ساتھ بمبئی نکل گیا۔

''ڈاکہ کیوں ڈالے گا؟''...... اتنا بولتے ہوئے اکھوری بابو بیوی کے قریب بیٹھتے ہوئے تفصیل جاننے اور بتانے کے ملے جلے انداز میں پھر بولے...... ''دوسری صورت بھی ہوسکتی ہے۔''

''دوسری صورت کیا ہوگی؟''

''میں نے پہلے اس کو کچھ بتایا تھا اور اس نے بیٹی کی شادی کی تیاری بساط بھر کر بھی لی ہے۔''

''ایسا اسے آپ نے کیا بتایا جو......''

''آٹھ نو مہینے پہلے کی بات ہے۔ اس کو میں نے مشورہ دیا تھا کہ تم کسی مولوی وغیرہ کو پکڑو اور کچھ پیسے دے دلا کر مزار پر کچھ دنوں کے لئے بٹھاؤ۔ بابا کا جنم دیوس مناؤ۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ عرس کا کام تین چار دنوں تک چلا۔ اس نے کافی پیسے کمائے، اپنی بیٹی کی شادی کی بہت ساری تیاریاں پوری کر لیں۔''...... اکھوری بابو مسکرائے اور ان کے چہرے سے مسکراہٹ پھسل پھسل کر ان کی بیوی کے چہرے پر گلال مل گئی۔

بیوی کو مسکراتا دیکھ کر ان میں اچانک لوچن کی بیٹی کے گھونگھٹ کا ستارہ چمک اٹھا۔ واپس کمرے میں آئے تو لوچن کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پہلے تو تھوڑا شرمندہ ہوئے پھر جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کنگھی کرنے کے لئے اندرا سارے میں آئے۔ ان کی بیوی نے اس بیچ چائے تیار کر لی تھی۔ چائے لے کر ان کے قریب آئی تو اک ذرا حیرت میں آکر پوچھ بیٹھی......

''کہاں چلے۔''

چائے کی پیالی ہاتھ میں لیتے ہوئے اکھوری بابو بولے۔

''تم کو کبھی کوئی سلیقہ نہیں آئے گا۔ خواہ مخواہ چیخنے لگی۔ لوچن بیچارہ چلا گیا۔ جانے کیا سوچے۔ ایک تو خود پریشان ہے۔ دوسرے......''

''اَب کیوں پریشان ہے۔''

''پریشانی کی بات ہی ہے۔ اب لڑکے والا اسکوٹر مانگ بیٹھا ہے۔''

''اس میں آپ کیا کریں گے؟''

''وہی انجانا خوف...... ارے میں اس سے کہوں گا کہ وہ اسکوٹر نہ دے۔ اسے ٹی وی دے دے۔ اسکوٹر مستری کو اسکوٹر کی کیا آوشیکتا...... ٹی وی ہوگا تو لوچن کی بیٹی اکیلی گھر میں پڑی پڑی من بہلایا کرے گی۔''

''بات اسکوٹر کی ہو، یا ٹی وی کی۔ آئے گا کہاں سے؟ بیوی نے طنز کیا۔''

''اسی کے لئے تو بیچارہ لوچن آیا تھا۔'' انہوں نے چائے کی خالی پیالی سامنے پڑے ٹیبل پر رکھتے ہوئے آئینے میں ایک بار پھر اپنا چہرہ دیکھا۔ آئینے میں بیوی کا چہرہ بھی دکھائی دے گیا۔ نظر بھر کے دیکھنے لگے تو عکس نے سوال کر دیا......

''آپ اب کیا کریں گے......؟''

''مجھے تم آج بھی وہی پہلے والا...... سمجھتی ہو...... میں کیوں پیسہ دینے لگا؟''

''پھر کیا کیجئے گا؟''

''وہی تو سوچ رہا ہوں۔''

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اکھوری بابو نے آئینے میں پھر اپنا چہرہ دیکھا اور یکا یک مسکراتے ہوئے باہر جانے لگے تو بیوی کے سوال نے پھر ان کو روک لیا......

''کیا کریں گے آپ؟''

''سوچتا ہوں کے لوچن سے کہوں کہ وہ پھر بابا کے مزار پر ایک بڑا عرس کرائے جو کم از کم ایک ہفتے تک چلے۔''

اکھوری بابو کی بیوی طنز اور حیرت کے ملے جلے انداز میں مسکرا کر بولی۔

''اب کون عرس ہوگا۔اب تو سال بھر بعد ہو سکتا ہے نا۔''

''ہاں...... ہاں...... یہ ٹھیک ہے...... کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔''

اکھوری بابو اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ایک اور عرس کرائے اور اب کے یہ کہے کہ اسی دن بابا کی بھکتی سوئیکار ہوئی تھی۔''

اتنا کہہ کر اکھوری بابو مسکرانے لگے اور ان کی بیوی کے چہرے پر اطمینان کا رنگ کوندگیا اور پھر اکھوری بابو گھر سے باہر نکل گئے۔

استعارہ-جولائی دسمبر ۲۰۰۱ء نئی دہلی		نئے افسانے کا معنوی استعارہ (انتخاب اور تجزیہ) ترتیب-راشد انور راشد ۲۰۰۱ء، نئی دہلی

کھلا دروازہ

یوں تو اور لوگ بھی تھے، لیکن ریاض صاحب نے ہی اس کو سنبھالا دیا۔

بیماری کے لمبے عرصے میں جب محسن گھر پر رشتہ داروں، دوستوں کے انتظار میں شام سے رات گئے تک رہتا تو اس کی بیوی کے فقروں کے تیر اور بچوں کی پریشانی زخم پر نمک کا کام کرتے۔ اب تو روٹی اور چاول کھاتے کھاتے طوطا بھی پنجرے میں خاموش رہنے لگا تھا۔

بیماری نے طول کھینچ لیا تھا۔ ساری جمع پونجی اور پھر بیوی کا چھوٹا سا خوبصورت سونے کا جھمکا بھی اس کے سنبھلنے تک کام نہ آسکا۔ اور آخر کار ایک دن بہت امید اور انتظار کے بعد ریاض صاحب کے یہاں بچوں کو بھیجنا پڑا۔

ریاض صاحب کے متعلق اس کا اچھا خیال نہ تھا۔ اگر اس کی رائے اچھی ہوتی تو شروع ہی میں ان سے رجوع کرتا۔ اچھی امید بھی کس طرح کرتا۔ اپنے اصطبل نما کمرے میں پڑا پڑا اکثر وہ انہیں برے ناموں سے ہی یاد کیا کرتا۔

''کیا ہوتا اگر ایک روشن دان ہی مجھے رکھ چھوڑنے دیتے۔'' اس کی باتوں میں اس کی بیوی شریک ہوتی تھی مگر زیادہ کچھ نہیں بولتی۔ ''اللہ سمجھے گا۔ تم اتنا غم کیوں کرتے ہو۔ بات تو پرانی ہوگئی۔''

بات پرانی ہوگئی۔ مگر ابھی تک اس کے دل میں ترازو بن کر اٹکی ہوئی تھی۔ ریاض صاحب نے اپنے گھر کی طرف نہ کوئی کھڑکی کھولنے دی تھی اور نہ روشن دان۔ اس کا دو کمرے کا مکان اس وجہ سے تاریک اور حبس زدہ ہوکر رہ گیا تھا۔ وہ اکثر کہتا۔

''نجمہ۔ ریاض صاحب کا کیا جاتا۔ وہ تو بڑے آدمی ہیں۔ اور پھر یہ کہ ان کا مکان تو کافی دوری پر ہے، بارہ فٹ پر۔ اور یہ تو راستہ ہے، مانا کہ ان کی زمین ہے۔''

''زمین ان کی ہوتی تو مکان ان کا اتنا پیچھے کیوں بنا ہوتا؟''

''پرانے زمانے میں اتنی زمین تو چھوڑتے ہی تھے نا۔''

''ٹھیک ہے۔ پر ادھر سے تو اور لوگوں کا راستہ ہے۔ اور کون سی کھڑکی کھولنی تھی، دروازہ نکالنا تھا۔ روشن دان تو ہو ہی سکتا تھا۔'' اس کی بیوی کے ہر لفظ میں محرومی اپنی کمان توڑ دیتی۔

محسن چنگا ہو چکا تھا۔ اب سرے سے روزی کمانے کی بات اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کبھی سوچتا۔ بڑے سیٹھ آئیں گے تو پھر کام مل جائے گا ——— لیکن بڑے سیٹھ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کوئی بتاتا بھی نہیں روز اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ سیٹھ کا کارخانہ بھی اب اتنا چلتا نہیں ہے، ورنہ بیمار ہونے کی اتنی بڑی سزا نہ ملتی کہ اس کو کام ہی نہ ملتا۔ لیتھ مشین کا یہ ایک اچھا کاریگر تھا۔ کارخانے میں اس کی پوچھ تھی۔ اسے روزی روٹی سے بڑھ کر ریاض صاحب کا قرض چکانے کی فکر بھی اب پریشان کرنے لگی تھی۔ ہفتوں کے بعد بھی جب کام نہیں ملا تو روٹی کے لالے پڑنے لگے۔ محلے کے دکان دار کے ادھار کی رقم اتنی بڑھ گئی کہ سامان دس روپے کے ملتے تو تقاضے اور ادھار بند کی دھمکی سو کی۔ ایک دن تنگ آکر کسی دوسرے کام لگ جانے کا ارادہ کر کے نکلا۔ شام کو ناکام ہی لوٹ گیا۔ نڈھال اور پژمردہ گھر

کے سامنے ریاض صاحب کی کار کھڑی دیکھ کر ابھی کچھ سوچ اور سمجھ بھی نہ پایا کہ انہوں نے آواز دی۔ ''محسن تھوڑا دھکے لگاؤ، کار اسٹارٹ نہیں لے رہی ہے۔'' کار کو ایک دودھ کا لگانے والوں میں یہ بھی شامل ہو گیا۔ مگر کار نے دھکوں کے بعد بھی اسٹارٹ نہ لیا۔ ریاض صاحب نے اپنے کارندے کو بھیج کر مستری بلوایا تھا۔ مستری اس بیچ آ گیا۔ اس نے ادھر کار میں ہاتھ لگایا اُدھر انہوں نے وقت گذاری کے لئے محسن سے اس کی طبیعت کے متعلق پوچھ لیا۔

''اچھا ہوں صاحب۔'' محسن نے جھینپ کر جواب دیا۔ اس کو ریاض صاحب کے پیسے یاد آ گئے ——— انہوں نے پھر پوچھا۔

''تم کام پر گئے نہیں؟''

''جا تو رہا ہوں۔ مگر کام نہیں مل رہا ہے۔''

''کیوں۔ تمہارا اپنا کام؟''

''اب وہاں کام نہیں ہے...... بڑے سیٹھ ہوتے تو رکھ بھی لیتے۔ اتنا دن جو بیمار رہا نا......''

''اس سے کیا ہوا، بترا کیا بولتا ہے؟''

''بترا صاحب کہتے ہیں کہ ابھی کام نہیں ہے۔''

''کارخانہ تو اس کا ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا ہے۔''

''جی۔ کارخانہ تو ٹھیک ہی ہے۔''

''اچھا۔ میں بترا سے بات کروں گا۔''

''بڑی مہربانی ہوگی، میں تو بہت پریشان ہو گیا ہوں۔''

''پریشانی کی کون سی بات ہے؟ تمہیں اگر پیسے چاہئیں تو اور لے لو۔''

''نہیں۔ نہیں۔'' محسن نے جلدی سے کہا۔ اس کو لگا کہ پیسے لے کر پہلے سے ہی شرمندہ ہے۔ اب اگر مزید لے لیا تو اور برا ہوگا۔ بولا۔

''کام شروع کر دوں گا تو پھر پریشانی......''

''اچھا۔اچھا۔'' اتنا کہہ کر ریاض صاحب کار میں بیٹھ کر نکل گئے اور محسن اپنے گھر میں امید کی ہلکی سی چمک لے کر داخل ہوا۔ نجمہ نے اسے دیکھتے ہی سوال کر ڈالا۔

''کام مل گیا؟''

''نہیں۔ ملا تو نہیں۔مل ہی جائے گا......'' اور اُسارے پر لٹکے ہوئے پنجرے کے پاس جا کر مٹھو مٹھو پکارنے لگا۔طوطے نے جواب میں پنجرے کا ایک دو چکر لگایا۔ نجمہ قریب آ کر بولی۔

''دکان دار نے آج تمہارے کام نہ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ وہ اب ادھار نہیں دے گا۔''

''ارے۔کل سے کام شروع کر دوں گا......''

''کس کے یہاں؟''

''اپنے کارخانے میں ہی۔''

''بڑے سیٹھ آ گئے کیا؟؟''

''پتا نہیں۔''

''پھر؟''

''ابھی ریاض صاحب سے بات ہوئی ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ بترا صاحب کو کہہ دیں گے۔''

''یہ —— ریاض صاحب —— یہ بترا کو کس طرح جانتے ہیں؟''

''وہ بھی کلب آتا ہے نا۔یہ جس کلب میں جاتے ہیں۔''

ریاض صاحب اور بترا صاحب کی ملاقات کا منظر جاگتی آنکھوں میں لے کر وہ بستر پر سونے کے لئے پڑ گیا۔اس کی بیوی بھی جانے کن خیالوں میں کھوئی تھی۔لمبی خاموشی کے بعد بولی۔

''ریاض صاحب سے تم ابھی پوچھ لو نا۔''

''ابھی کس طرح ...... وہ تو بڑی رات کو آتے ہیں۔''

''کیا ہوگا ——— ہم کچھ دیر اور جاگ جائیں گے۔''

''نہیں، نہیں ——— صبح پوچھ لیں گے۔''

''صبح کام پر نکل جانا...... کیا ہوگا، بات ہی کرلو۔''

باتیں کرتے کرتے دونوں خاموش ہوگئے۔ کل کام پر جانے کی امید میں محسن کو نیند آگئی۔ بیوی اس کی جاگ رہی تھی۔ اس کو نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کا چھوٹا بچہ بار بار اس سے لپٹتا چلا جارہا تھا اور تھوڑی دیر بعد رو بھی دیتا۔ ایسے میں اس نے محسوس کیا کہ ریاض صاحب کلب سے لوٹ رہے ہیں۔ ان کے کار کی آواز پر وہ اٹھی۔ اٹھ کر محسن کو جگانے لگی۔

''اٹھو۔ اٹھو بھی۔''

''اونھ'' نیند میں محسن کی آواز گونجی۔

''سنو۔ ریاض صاحب آگئے۔''

روز کی طرح ریاض صاحب کی کار ان کے دروازے پر لگی تو اس کا ہورن رات کے سناٹے میں دراڑ پیدا کر گیا۔ یہ ان کے روز کا معمول تھا۔ وہ تیسوں دن شام میں کلب جاتے اور بارہ بجے سے پہلے کبھی نہیں آتے۔ اور آتے ہی ان کی کار کا ہارن اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ بج اٹھتا ——— ''پونپ'' ——— اب سے پہلے جب جب ہارن بجا تو محسن اور اس کی بیوی نے بہت برا مانا تھا۔ اور یہ جنم جات دکھ ہزار کوششوں کے بعد بھی انہیں اس کا عادی نہ بنا سکا تھا۔ آس پاس کے اور لوگ بھی خوب خوب جلتے بھنتے مگر کسی نے آج تک ریاض صاحب سے کچھ نہ کہا تھا۔ بلکہ کسی سے بھی کچھ نہ کہا۔ ان کی حیثیت کے آگے سب اس دکھ کو خاموشی سے جھیلتے چلے جارہے تھے۔ کبھی کبھی ایک دو گھر کی عورتیں بس باتیں کرلیتیں۔۔ ''عجیب بات ہے، بارہ بجے اتنے زور سے ہارن بجانے کا کیا مطلب ہے۔ گھر کے لوگوں کو کنڈی بجا کر، کال بیل بجا کر بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔''

ہارن پر اکثر چونک کر اٹھ جانے والا اور ''پونپ'' کی آواز پاتے ہی زمین پر ''تھو'' کرنے والا محسن آج ریاض صاحب کے متعلق برا نہ سوچ سکا تھا۔ اس کی بیو کہہ رہی تھی۔

''جاؤ نا۔ مل لو۔''

''صبح کو مل لیں گے۔ کوئی بھاگے جا رہے ہیں؟'' محسن نے ایک لمبی جماہی لی۔

''مل لیتے تو اچھا ہوتا۔'' نجمہ نے مزید ٹہوکا لگایا۔

''ارے نہیں۔ جانے کلب سے کس موڈ میں...... چلو سونے دو۔''

صبح ریاض صاحب نے اپنے نوکر کو بھیج کر اسے کارخانے جانے کا مژدہ کہلا بھیجا تو زندگی برس پڑی تھی۔ پھر جلدی جلدی تیار ہو کر محسن کارخانہ چلا گیا۔ اس نے جاتے ہوئے طوطے کے پنجرے کی طرف دیکھا تک نہیں۔ طوطے نے اپنے مخصوص انداز میں جب اسے بدائی دی تو وہ ہاتھ اٹھا کر تھوڑا مسکراتا ہوا نکل گیا۔ شام کو جب آیا تو سیدھے گھر میں داخل ہونے سے قبل ریاض صاحب کا شکریہ ادا کرنے چلا گیا۔

زندگی نے پھر ایک بار اپنی کھوئی ہوئی رفتار سنبھالی تھی۔ گھر پھر سے اپنی دھری پر گھومنے لگا۔ دکان دار مان گیا تھا۔ اس کی امید توانا ہو گئی تھی۔ لیکن اب لگی ایک فکر ــــــ ریاض صاحب کو رقم لوٹانے کی۔ اس کی کھوئی ہوئی رمق واپس نہ لا پا رہی تھی۔ پھر وہ دن آئے جب اسے تنخواہ ملی، ملنے لگی۔ دکان دار کا قرض تو فوراً پورے کا پورا ادا نہ کر سکا۔ ایک دو ضروری کام جو نبٹانے پڑے۔ کسی ماہ چھوٹے بچے کی دوا بھی بیچ میں اچھل پڑی۔ اس لئے ریاض صاحب سے ملنے محسن شرمندگی کے ساتھ ایک دن کارخانہ جانے سے پہلے پہنچا تو انہوں نے دریا دلی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے محسن کو مطمئن کیا۔

''کوئی بات نہیں۔ سو دو سو کی بات ہے ہاتھ میں پیسے آ جائیں تو دے دینا۔''

''آپ کا بڑا احسان ہے۔'' محسن اور بولتا بھی کیا۔

''احسان کی کون سی بات ہے۔ اچھا ہے کام پر جانے بھی لگے ہو۔ ابھی تو تم شاید

کارخانہ کے لئے ہی نکلے ہو؟''

''جی۔ جی ہاں۔''

''تو ایسا کرو۔ آج تم میرا ایک کام کرتے آنا۔ گھر لوٹتے ہوئے تھوڑی سی سبزی لے لینا۔'' جیب سے پیسے اور گھر سے ایک تھیلا منگوا کر محسن کے حوالے کرتے ہوئے وہ تھوڑا مسکرائے۔ اور محسن آداب سلام کے بعد جھومتا ہوا کام پر نکل گیا۔

کام پر سے لوٹتے ہوئے اب روز ہی ریاض صاحب کی سبزی لانا اس کی ڈیوٹی ہوگئی۔ یہ بات اس کی بیوی کو شروع میں تو بری نہ لگی۔ شاید احسان کا بدلا چکانے کا موقعہ غنیمت ان کے ہاتھ آ گیا تھا۔ مگر یہ سلسلہ چل نکلا تو اس نے ایک دن چپکے سے تجویز بھرے لہجے میں کہا۔

''اب تو روز ہی وہ سبزی لانے کہہ دیتے ہیں۔''

''ارے ہاں -- چلو ٹھیک ہے، ہمارا کیا جاتا ہے، کارخانے سے گھر ہی لوٹتا ہوں۔ تھوڑی سبزی ان کے لئے لے کر آ جاتا ہوں......''

''کبھی تم نے اپنی سبزی اس قدر اچھے ڈھنگ سے نہ لائی...... انہیں بھی کیا سوجھی کہ اب روز......''

''ان کا احسان ہے۔ اس بات کو بھولو مت۔ کیا ہوگا۔ دیکھو جب کوئی ہمیں دیکھنے نہیں آتا تھا تب انہوں نے پیسے بھیج دیئے۔ میں نے بچے کے ہاتھ ہی مانگ بھیجا تھا۔ اور بترا صاحب مان نہیں رہے تھے۔ انہوں نے ہی اسے کہا......''

''یہ سب تو ٹھیک ہے...... ان کے نوکر بھی تو ہیں۔ کبھی تو......''

''چھوڑو بھی۔ ہمیں اس سے کیا؟''

''روز و شب گزرتے گئے۔ پر اتنا پیسہ چھ ماہ گذر جانے پر بھی نہ بن پایا کہ ریاض صاحب کا قرض اتر جاتا۔ انہوں نے بھی کبھی تاکید نہ کی۔ لیکن اکثر جب محسن اور اس کی بیوی آپس میں باتیں کرتے تو ریاض صاحب کا قرض بیچ میں اٹک جاتا اور خاموشی ان کے بیچ چپکے

سے آکر اپنے لئے جگہ بنالیتی۔ اور پھر گھر میں باہر میں کارخانے کے اندر کام کرتے ہوئے۔ قرض کی ادائیگی کا احساس محسن کو گھن کی طرح کھانے لگا۔ محسن کو متفکر دیکھ کر بیوی نے گھر کے خرچ کو کچھ کم کر دیا تھا اور دکان دار کے بل میں کمی آگئی تھی۔

ایک شام دکان دار کا بل ادا کر کے وہ گھر آیا تو اس کے پاس تین سو روپے بچ گئے تھے۔ گھر پر پہننے والی نجمہ کی ساڑی ایک دو جگہ سے پھٹی دیکھ کر اس نے کل ہی نجمہ کے لئے ساڑی خریدنے کی بات کی تو وہ چونک گئی۔ اس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ ہمیں سب سے پہلے ریاض صاحب کا قرض چکانا ہے۔''

''وہ بھی ہو جائے گا۔''

''نہیں ایسی ساڑی مجھے نہیں پہننی ہے......تم بڑے آدمی کو نہیں جانتے ہو......''

''جانتا کیوں نہیں ہو؟''

''میں پہنوں گی ہی نہیں۔''

''تو ٹھیک ہے ایسا کرتا ہوں کل میں تین سو روپیہ ریاض صاحب کو دے دوں گا، باقی آدھی رقم بعد میں دینے کی بات کرلوں گا۔''

دوسری صبح جب کارخانے سے قبل سبزی کی تھیلی لینے ریاض صاحب کے دروازے پر پہنچا تو ریاض صاحب خود اس کے منتظر ملے۔ اس نے تین سو روپئے نکال کران کے آگے بڑھا دیا۔

''یہ تین سو ہیں، آدھی رقم بعد میں دوں گا۔''

''نہیں نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے، تم ایک ساتھ دے دینا۔''

محسن کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک فوراً ماند پڑ گئی۔ اس نے جھینپ جانے کے انداز میں معذرت کی۔

''ایک ساتھ تو مشکل پڑیگا......آپ اسے رکھ لیجئے۔''

بڑی منت کرنے کے بعد بھی وہ پیسہ لینے کو راضی نہ ہوئے تو واپس گھر آ گیا۔ بیوی کے پاس روپیہ رکھ کر کارخانے کے لئے نکل پڑا۔ ہاتھ میں سبزی کا خالی تھیلا اسے بھرے ہوئے تھیلے سے بھی بھاری لگنے لگا تھا۔

اسی شام کو سبزی دینے ان کے دروازے پر پہنچا تو سبزی دیتے ہوئے مسکرانا بھول گیا۔ اسے لگا کہ ریاض صاحب کی شہرت، دولت اور ان کی شخصیت، سب سمٹ گئی ہے اور اب وہ صرف ایک مکڑے کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور اس کا وجود مکھی میں تبدیل ہو گیا ہے —— بوجھل قدموں سے جب گھر کی طرف پلٹا تو خاصی تاخیر ہو گئی تھی۔ کارخانے میں کچھ نیا کام نکل گیا تھا جس کی وجہ سے بھی دیر ہوئی تھی۔ اس نے سبزی کا تھیلا ریاض صاحب کے نوکر کے ہاتھ میں دے کر گھر کا رخ کیا تھا۔ جب ہی ریاض صاحب کی آواز پر پلٹنا پڑا۔ انہوں نے کوئی بات تو نہ کی صرف اپنی کار میں دھکے لگانے کا اشارہ کیا۔ اور کار میں بیٹھ گئے۔ ان کو کلب جانے میں دیر ہو رہی تھی۔ محسن نے بھی اسی میں عافیت جانا۔ اس نے نوکر اور کسی کام سے ریاض صاحب سے ملنے آئے ایک مقامی دکاندار کے ساتھ دھکے لگائے۔ کار اسٹارٹ ہو گئی اور پیچھے رہ جانے والے دھوئیں کے مرغولے میں اپنے آپ کو گھرا محسوس کرتے ہوئے محسن گھر میں داخل ہو گیا۔ انتظار میں بیٹھی نجمہ نے دیر سے آنے کا سبب جاننا چاہا —— اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

سبزی کے ساتھ کار میں گاہے گاہے دھکا لگانا اب ان کے کام میں شمار ہو گیا تھا۔ دھکا لگانے کے لئے جب بھی اسے گھر سے بلایا جاتا تو وہ خاموشی سے نکل پڑتا مگر اس کی بیوی کو یہ بات اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ اکثر کہتی۔

''ابھی تم نے ہاتھ منہ دھوئے بھی نہیں اور......'' محسن خاموش رہتا، چاہتے ہوئے بھی احتجاج نہ کر سکتا۔ بڑی بڑی مشکلوں سے اس نے ایک شام ساری رقم دے کر اپنی پریشانی سے نجات حاصل کی۔ اب ایک ذرا عافیت محسوس کرنے لگا تھا۔ ہلکی ہنسی اب گھر میں ان دونوں کے بیچ ہر موڑ پر در آنے لگی تھی۔ مگر سبزی کا تھیلا اب بھی ان سے نہ چھوٹا تھا۔ جب بھی

اس نے انکار کی بات سوچی تو دال روٹی حلق میں اٹک اٹک جاتی اور صبح پھر وہی ہوتا جو ہوتا چلا آرہا تھا۔

اسی بیچ ایک شام کچھ سویرے لوٹنے کے وعدے پر وہ کارخانے نکل گیا اور نجمہ رات کا کھانا بھی شام ہی میں بنا کر اس کا انتظار کرنے لگی تھی۔ اس نے اپنی سہیلی کے گھر اس کی بیٹی داماد کو دیکھنے اور ملنے ملانے کا پروگرام بنایا تھا۔ شام کی دھند کمرے سے نکل کر جب آنگن میں پھیلنے لگی تو اس نے دروازے پر جا کر ادھر ادھر دیکھا مگر محسن نہ آیا۔ شام آنگن میں ہر طرف بکھر گئی تھی اور رات کمرے میں دبے پاؤں داخل ہونے لگی تھی۔ ریاض صاحب کی کار کسی طرح دھکے کھا کر دھوئیں چھوڑتی ہوئی کلب کی طرف چل پڑی تھی، مگر محسن نہ آیا۔ نجمہ کی بے چینی اب رقص کرنے لگی تھی۔ اور اس کی تال پر نجمہ آنگن سے اسارے اور اسارے سے کمرے میں آتے جاتے بوجھل ہوتی جا رہی تھی ——— مٹھو نے دیرینہ محبت کا پاس رکھتے ہوئے ہر دو منٹ پر خیریت پوچھنا شروع کر دیا تھا ——— نجمہ کو کبھی محسن پر غصہ آتا، کبھی کارخانے میں اچانک بڑھ جانے والی مصروفیت پر ——— اور کبھی اپنے آپ پر، تو کبھی طوطے پر جس کی میٹھی آواز ایسے میں بے حد کڑوی لگ رہی تھی۔ وہ اسارے کے بڑے پلنگ پر خاموش آ کر بیٹھ گئی۔ ابھی ٹھیک سے دَم بھی نہ لینے پائی تھی کہ دروازے کی کنڈی بجی اور انجانے خوف سے کانپتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھی ——— کوئی محسن کا نام لے کر آواز دے رہا تھا۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو ریاض صاحب کا نوکر کھڑا تھا۔ اس نے محسن کے بارے میں دریافت کیا۔ نجمہ نے نفی میں سر ہلایا، پھر اندر کی طرف لوٹ گئی۔ اس کی بے چینی میں اب سکوت آ گیا۔ طوطے کی آواز دینے کا وقفہ طویل ہو گیا۔ لوٹ کر وہ پھر پلنگ پر آ بیٹھی اور طرح طرح کے وسوسوں کے بیچ ریاض صاحب کی بے گاری سے نکل بھاگنے کا منصوبہ بھی بنانے لگی۔ وہ کسی بات پر تھوڑی دیر سے زیادہ نہ سوچ سکی۔ اسے ہر راستہ مقفل نظر آتا اور بند راستے پر کھڑا محسن، خاموش نظروں سے نہارتا رہتا ——— نجمہ نے اب جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ رات گھر کے ہر حصے میں پسر چکی تھی۔ بچے سونے لگے تھے پھر اس نے کپڑے

بدل ڈالے، کمرے سے باہر آئی تو دیکھا کہ محسن آنگن میں سست قدموں سے چلتا ہوا اس کی طرف آرہا ہے۔ یہ اس کی طرف جھلاتی ہوئی بڑھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی پھٹ پڑی۔

''ابھی اگر تمہارے کسی ملنے والے کے یہاں جانا ہوتا تو تم وقت سے پہلے چلے آتے۔''

محسن خاموش رہا...... آنکھوں میں تاسف لئے کمرے میں داخل ہو گیا۔ نجمہ اس کے پیچھے پیچھے آئی اور پھر بول پڑی۔

''اب کیا جانے کا وقت رہا؟...... کیا سوچ رہے ہو۔''

''ہوں۔ نہیں۔ اب پھر کبھی۔''

''پھر کب؟ تم نے دیر کیسے کی؟ بھلے آدمی ...... کہہ دیا ہوتا کہ آج گھر پر کچھ کام ہے۔ کارخانہ کیا بھاگا جا رہا تھا۔ یا تم بھاگے جا رہے تھے؟''

''کارخانے سے تو میں بہت پہلے آ گیا تھا۔''

''پھر ——— پھر کہاں رہ گئے؟''

''بھئی ریاض صاحب کی گائے دو دنوں سے بیمار تھی ...... انہوں نے کہا...... اب کھونٹے توڑ دیتی۔''

''ریاض صاحب کی گائے کو تم......؟''

''اسے مویشی اسپتال لے کر گیا تھا۔'' اس کے ہونٹوں پر ہنسی چٹکنے لگی۔

''تم؟؟''

''وہیں دیر ہو گئی نا۔ کوئی تھا نہیں...... اور مست رام بھی بے سدھ پڑا تھا۔''

''دیکھو'' نجمہ اچانک چمک اٹھی پھر لرزنے لگی ——— ''ایسے ہوگا نہیں۔'' نجمہ نے ٹھنڈی سانس لی اور بہت سی ہوا اپنے اندر اتارتے ہوئے بولی ——— ''اب ریاض کا پیسہ بھی تم دے چکے ہو۔ اس سے جان چھڑاؤ۔''

''جان کیا چھڑانا...... ان کی گائے بیمار تھی......''

''ان کے کارندے کیا مرگئے ہیں۔ وہ خود......'' نجمہ نے بلند آواز میں کہنا شروع کیا تو محسن نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا ——

''تم کیا پاگل ہوگئی ہو۔ اس میں چیخنے کی کیا بات ہے؟ اتنے اونچے......''

''نہیں۔ یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ تم اب ریاض کا کوئی کام نہیں کرو گے...... اپنے تو خود مست رام بنا......''

نجمہ اٹھ گئی۔ سامنے پڑے ایک دو برتنوں کو چننے لگی اور اس بیچ باتوں کا سلسلہ برقرار رکھتے ہوئے گویا ہوئی''۔ اب اگر کوئی بلانے بھی آجائے گا تو میں کہہ دوں گی کہ نہیں جاسکتے۔''

''یہ کیسے ہوگا؟''

''کیسے نہیں ہوگا۔''

باتوں میں الجھتے سلجھتے رات کافی ہوگئی۔ دونوں نے اس بیچ کھانا کھالیا تھا، اور سونے کو بستر پر دراز بھی ہوگئے۔ نجمہ کا غصہ تھوڑا کم ہوگیا تھا۔ محسن سو جانے کے درپے تھا۔ نجمہ اپنے بستر پر سے اٹھی، اٹھ کر محسن کے بستر پر آئی، سرہانے میں خاموشی سے بیٹھ گئی۔ ایک لحہ محسن انتظار کرتا رہا۔ پھر کروٹ بدل کر اس کی طرف مڑا، اس کے ہاتھوں کو ملائمیت سے اپنے ہاتھوں میں لے کر تھوڑا مسکرایا، پھر بول پڑا۔

''کیا ارادہ ہے؟''

نجمہ نے اس کی مخاطبت سے فائدہ اٹھانے کے لئے جلد ہی اپنی رازداری کی گٹھری کھول دی۔

''آدمی کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔''

''ہوتی ہے...... ہماری بھی ہے، اپنی زندگی ہے۔'' محسن نے جواب دیا۔

''سنو، میں کہہ رہی تھی کہ اب تو ریاض صاحب پیر پھیلانے لگے ہیں۔ میں نے تم سے کچھ کہا نہیں......'' نجمہ پر چھائی ہوئی سنجیدگی اور گہری ہو کر جہاں تہاں سے چیخ گئی۔ جسے

ٹٹولتے ہوئے محسن نے کہا۔

''کیا؟''

''اکثر ان کے گھر سے مجھے بھی کوئی نہ کوئی کام بھیج دیا جاتا ہے میں کرتی رہی ہوں......''

''تمہیں کون سا کام بھیج دیتے ہیں؟'' محسن سوال کرتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ اسے لگا کہ نجمہ بھی ایک مکھی بن گئی ہے اور اس کی راہ میں بھی جالے آگئے ہیں۔ اس نے پھر سوال کیا۔

''کیا کہہ رہی تھیں؟'' —— نجمہ کب تک منقار زیر پر رکھتی، پھٹ پڑی۔

''میں کہہ رہی تھی کہ ہمیں اب ہمت سے کام لے کر انکار کر دینا چاہئے۔''

''انکار تو نہیں کر سکتے ہیں...... تب یہ ہے کہ ایسا کتنا دن چلے گا؟''

''کتنا دن کیا؟ روز و شب وہ اپنے احسان کے جال کا بندھن سخت کرتے جا رہے ہیں۔'' —— نجمہ کے لہجہ میں تختی تھی۔

''ارے نہیں۔ احسان کیا؟ ہم نے تو پیسہ واپس کر دیا ان کا''

''کام پر پھر سے جو لگوایا انہوں نے۔''

''کام پر کیا —— وہ تو لگنا ہی تھا۔''

''تو پھر تم ان کے غلام کیوں ہو گئے ہو، بلکہ ہم ان کے غلام......''

''اس میں غلامی کی کیا بات ہے، بڑے آدمی ہیں...... کبھی نہ کبھی کام......''

''بڑے آدمی اپنے گھر کے ہیں۔ اک ذرا مدد کر دیا تو لگے اب غلامی کرانے۔ شروع سے دیکھ رہی ہوں، تم سمجھتے ہی نہیں —— یاد نہیں —— بیماری کے وقت پیسہ دیا تھا تو ڈاکٹر کا نام بھی بتا کر تاکید کر دی تھی کہ اس کے پاس جانا ہے —— اب ہمیں جو اچھا کرے گا...... ہم تو اسی کے پاس جائیں گے نا، اب تو آس پڑوس کے لوگ بھی ......'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کی بھیگی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے محسن بڑے اطمینان

اور سکون سے اسے منانے سمجھانے لگا۔

''نجمہ۔ دیکھونا۔ ہمارے تمہارے رشتہ دار، دوست واحباب کوئی پوچھ نہیں رہا تھا۔ انہوں نے پیسے سے مدد کی۔ ہم اچھے ہوئے، کام نہیں مل رہا تھا۔ ان کا قرض بھی چڑھ گیا —— دکاندار الگ پریشان کرنے لگا تھا۔ انہوں ے بترا صاحب کو کہہ کر کام دلوایا۔ ارے تھوڑا بہت ہم کردیں گے تو کیا ہوسگا۔''

''نہیں۔'' نجمہ نے جھڑک دیا۔ ''تم بات سمجھو، ہم اب اور......لوگوں کے طعنے اور طنز نہیں سہہ سکتے —— نہیں کچھ کرسکتے ہو تو یہ کام چھوڑ دو یا کارخانہ، پھر تو......''

''دوسرے کام میں اتنا پیسہ نئے آدمی کو کوئی دے گا......کارخانہ کیسے چھوڑ دوں؟''

''ایسا کرو۔ دوسرے شہر چلو، وہیں کام کریں گے۔''

''ارے پگلی —— رائی کو پہاڑ بنا بیٹھی ہے۔ چلو سونے دو۔''

''سوتے رہنا، لیکن پہلے یہ فیصلہ کرو کہ ہم اب ان کے جال سے نکل جائیں گے۔''

''جال کیسا —— اور اگر یہ جال ہے تو ہم کبھی نہیں نکل سکتے۔''

''کیوں نہیں نکل سکتے۔ تم چاہے جو کرو میں تو اب کام کا بہانہ کرلوں گی۔''

''کرلینا —— مگر ایسے میں اپنا کیا جاتا ہے؟''

''کیا جاتا ہے!! ہم اپنا کام چھوڑ کر ان کا کام کرتے ہیں ...... دیکھو گھر کیسا اجڑا پڑا ہے۔ اپنی صورت دیکھو۔''

نجمہ کی باتوں میں صداقت تھی۔ احسان کے بوجھ تلے ہاتھ پاؤں سب دب گئے تھے۔ پھر بھی دل میں اکثر کوئی پرندہ پھڑ پھڑا جاتا اور برہم کر جاتا۔

باتوں باتوں میں نیند کب آئی اور رات کس طرح دبے پاؤں نکل گئی۔ پتا ہی نہ چلا —— تعطیل کا دن تھا اس لئے نجمہ نے آج محسن کو سویرے اٹھایا بھی نہیں اور وہ بھی جاگ جاگ کر پڑا رہا۔ شاید سوچوں میں گم تھا۔ اس کے پاس چائے لئے جب نجمہ پہنچی تو اس

نے اس کو بٹھالیا۔ایک لمحہ خاموش رہا پھر بولا ——— ''ہم اگر چاہیں بھی تو نہیں ہو سکتا۔''

نجمہ تھوڑا تھوڑا واقعے کو سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھ سکی —— ''کیا؟'' ——— اس نے صرف اتنا ہی کہا۔محسن نے نجمہ کو ایک نظر دیکھا،اس کی آنکھیں سرخ تھیں،پھر بولا ———

''نجمہ ہر آدمی اپنا مقدر لے کر آیا ہے۔'' نجمہ خاموش رہی۔اس کی طرف دیکھتی رہی،پھر آنگن کی طرف اپنے چھوٹے بچے کی آواز پر دوڑ پڑی۔بچہ آنگن میں چلتے چلتے گر گیا تھا۔بچے کو اٹھاتے ہوئے اس نے وہیں سے کہا۔

''تقدیر بدلی بھی جاسکتی ہے۔لیکن اس کے لئے ہمت کی ضرورت ہے۔جو تم میں نہیں۔''

''نجمہ'' ——— محسن نے اونچی مگر دھیمی آواز میں کہا ——— ''مجھے تو کوئی پریشانی نہیں لگتی۔ہم اسے اپنی زندگی کا ایک حصہ سمجھ لیں تو......؟''

ہر بات کا جواب نہیں ہوتا۔اور خاموشی بھی تو سوز بانوں کی ایک زبان ہے۔دن گذر گیا۔شام ہونے کو آئی،مگر نجمہ نے کوئی بات نہ کی،صبح سے ہی اس کی اس ادا پر محسن معاملات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔کبھی گھر کے کسی چھوٹے موٹے کام میں لگ جاتا کبھی یوں ہی اسارے اور کمرے میں آنے جانے لگتا۔کبھی پنجرے کے پاس کھڑا ہو کر مٹھو مٹھو کرتا۔اس نے ایک دو بار کوشش کی۔کوئی سوال کیا بھی تو نجمہ نے اسے ''ہوں'' اور ''ہاں'' سے آگے جواب نہیں دیا۔گھر کا منجمد ماحول اور بھی ٹھوس ہوتا گیا۔جسے ہر طرف سے آنچ دکھانے کے لئے محسن نے ہمت کی۔تمام مصالحت کو یکجا کرتے ہوئے نجمہ کے سامنے جا بیٹھا۔نجمہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس نے مخاطب کیا۔

''دیکھ رہی ہو ——— اس پرندے کو ——— دیکھو میں نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا ہے۔''

''کیا؟'' نجمہ چونک پڑی ——— ''آپ بھی کمال......''

محسن نے اٹھتی ہوئی نجمہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔''نجمہ رک جاؤ ——— دیکھو ——— یہ

کبھی نہیں اڑ سکتا!''

''یہ آپ کس طرح کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ پنجرہ اس کی تقدیر ہے۔ یہ پنجرے سے گھل مل گیا ہے۔ اڑ جانا چاہے گا بھی تو نہیں اڑ سکتا۔''

''پرندہ تو اڑنے کے لئے بنا ہے ــــــ اڑے گا کیوں نہیں'' ــــــ اس بیچ کھلے ہوئے پنجرے میں ایک دو چکر طوطے نے لگایا اور کچھ خاص قسم کی آواز بھی نکالتا رہا ــــــ

''نجمہ یہ کھلا پن بھول بیٹھا ہے۔ یہاں ہی اسے اچھا لگتا ہے۔ اگر باہر نکل بھی گیا تو اندر ہی جا کر بیٹھ جائے گا۔''

خود کو اس نے طوطے کے وجود میں محسوس کیا۔ پنجرے پر فاتحانہ نگاہ ڈالے رہا۔ طوطا اپنی منقار سے کھانے کی کٹوری پنجرے کے دروازے تک لے آیا تھا۔ کٹوری پھر اس نے باہر کی طرف گرا دیا ــــــ پیتل کی کٹوری ایک جھٹکے سے نیچے گری تو نجمہ مڑی۔ اسے اٹھانے کو اٹھ کھڑی ہوئی ــــــ ایک قدم چل کر پنجرے کے پاس جھکی تو کان پر ہواؤں کے کانپتے جھونکے محسوس کئے ــــــ پھر ''ٹائیں ٹائیں ــــــ ٹائیں۔'' نظر اٹھا کر دیکھا تو طوطا کھلی فضا میں اس کے گھر کی چہار دیواری سے اوپر اڑتا چلا جا رہا تھا...... نجمہ کے چہرے پر عجیب رنگ آ گیا۔ جیسے طوطا پنجرے سے نہیں، اس کی مٹھی سے اڑ گیا ہو۔ لیکن محسن مسکرا رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں اڑ جانے والے طوطے کی آنکھوں کی چمک سیال بن کر تیرنے لگی۔

صریر۔ مارچ ۱۹۹۴ء
کراچی

زبان و ادب۔ ستمبر دسمبر ۱۹۹۴ء
پٹنہ

اس کا آدمی

ماں کی بے چینی آج عروج پر تھی۔ اس لئے اس کا پریشان ہو جانا ظاہری بات تھی۔ بازار جانا ضروری ٹھہر گیا تھا، حالانکہ دل تو نہ چاہ رہا تھا لیکن ماں کی پریشانی ——— دیکھی نہیں جاتی۔ اور حالات بھی کسی قدر...... اپنے آپ کو وہ ان باتوں سے مبرّا سمجھ رہا تھا۔ لیکن انجانا خوف جو ماحول میں رچ بس گیا تھا، اس کے اندر سراسیمگی کے جال بن رہا تھا——— لیکن وہ اب اور انتظار نہ کر سکتا تھا۔ بیوی کے لئے یہ بات عجیب ہو گئی تھی۔ اس کا کوئی ناگزیر ذاتی کام بھی ہوتا تو ہرگز راضی نہ ہوتی۔ ہمت کر کے کچھ کہنا چاہتی مگر خاموش رہ جاتی۔ الجھنوں میں اس نئے اضافے کے علاوہ حالات سے سمجھوتے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں ان سب باتوں سے کیا جو احتیاط کو ضروری کاموں پر ترجیح دیں اور آدھ ایک گھنٹے کا تو معاملہ ہے۔ خاموش رہنا چاہتے ہوئے بھی اس نے اپنا مشورہ دہرایا۔

''پٹیل چوک کی طرف سے مت جانا۔ تھوڑا گھوم......''

پٹیل چوک کی طرف سے کیوں جانے لگا!!'' اس نے اپنی بیوی کا جملہ اچکتے ہوئے

کہا۔

''میں کہہ رہی تھی ۔تھوڑا گھوم کر ہی جانا پڑے گا،تم آصف علی روڈ سے نکل جانا۔''

''نہیں ۔نہیں میں بودھ مارگ سے نکل جاؤں گا۔''

''ہاں ۔ہاں'' بیوی کی پیشانی چمک اٹھی ۔ جیسے سر پر چلچلاتی دھوپ کے آگے یکا یک بادل آگیا ہو۔اس نے ایک نظراس پر ڈالی پھر بول پڑی۔''سنو یہ پاجامہ کرتا پہن کر مت جاؤ۔''

''کیوں؟اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''ہوگا کیا!تم پینٹ شرٹ پہن لونا۔''

جواب میں یہ تھوڑا مسکرایا۔ بیوی کی بات مان لینا تو اس کی عادت تھی پر بازار جانے کے لئے پوشاک تبدیل کرنا اس نے ضروری نہ سمجھا۔ بازار تو بازار ہے۔ ہر طرح کے لوگ —— کالے گورے —— دبلے موٹے ——

وہ گھر سے نکل پڑا تھا۔ اخبار پڑھ کر آج صبح سے تھوڑی اداسی اس کے اندر آگئی تھی ۔کرفیو —— بم بلاسٹ- چھاپے —— ان باتوں میں اب کوئی اثر تو باقی نہیں تھا پھر بھی —— اخبار کا خیال آتے ہی اس نے ایک بھدّی سی گالی دی ——

بازار کا رنگ اس کی توقع کے مطابق چوکھا تھا۔ مگر سامنے گلی کی نکڑ پر چند لوگوں کو کھڑا دیکھ کر وہ تھوڑا ٹھٹھک گیا پھر اسی گلی میں تیزی سے داخل ہوتے ہوئے اس نے سوچا کہ کیا ہوگا اسی طرف سے اگلی گلی میں نکل جائے گا۔ آگے بڑھتے ہوئے سامنے کی دکان پر بیٹھے تین چار لوگوں نے اسے گھورا تو دل ہی دل میں بول پڑا--- ''کیوں گھور رہے ہیں'' اور پھر اچانک اسے یاد آیا۔ وہ آدمی جس نے چار قدم پہلے اس کے چہرے پر سگریٹ کے دھوئیں چھوڑے تھے۔ سگریٹ بھی اس کے آگے اچھال دیا تھا۔

ایک خاص دکان سے ماں کے لئے ناس خریدنا تھا۔ اس کی ماں بیچین تھی —— ماں کا خیال آتے ہی اس کے سامنے ماں کھلکھلا کر کھڑی ہوگئی۔ تب اس کی ہتھیلی پر ناس کی پڑیا

تھرک اٹھی تھی۔

وہ متعلقہ دکان پر پہنچا۔ دکاندار سے کچھ باتیں کرنا چاہیں۔ ایک دو بار مسکرا مسکرا کر اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑیں۔ اخبار سے نظر اٹھا کر دکاندار نے دیکھا اور پھر خاموشی سے اخبار پڑھنے لگا۔ اس نے ماں کے لئے ناس کی پڑیا لی اور جھٹا جھٹ پلٹ گیا۔ ذہن میں طرح طرح کی باتیں اٹھنے لگیں —— ایسے نہیں ہوگا...... شریف آدمی کو سامنے آنے ہوگا خواہ مخواہ لوگ پکڑے جا رہے ہیں...... اس طرح تو کوئی بھی......

اچانک کسی سے دھکا کھا جانے پر خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے کھڑا آدمی تھوڑا مسکرایا۔ ایک آدمی اور اس کے سامنے رک گیا۔ اس نے جب آگے بڑھنے کا راستہ مسدود دیکھا تو کترا کر نکل جانا چاہا۔ تبھی ان میں سے ایک نے زور کا دھکا دے کر بولا——

''دیکھ کر نہیں چلتا۔''

''کیوں؟''

''اندھا ہے کیا؟'' دوسرے نوجوان نے فقرہ کسا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے نرمی سے کہا۔

''معصوم بنتا ہے۔'' پہلے نوجوان نے بلند لہجے میں کہا۔

ان کے بیچ دو چار لوگ جمع ہو گئے۔ ان لوگوں میں سب سے لمبے شخص نے کچھ جاننے کی کوشش میں پوچھا۔ ''کون ہے رے؟'' یہ بالکل تھرّا گیا۔ سب پر ایک نظر ڈالی اور نکل آنے کی کوشش میں آگے بڑھا۔

اس کے آگے بڑھتے ہی ایک نے کرتے کا دامن پکڑ کر کھینچا۔

''جاتا کہاں ہے؟'' —— پھر پیچھے سے ایک آواز اٹھی۔ ''مارو۔ مارو۔ پاکٹ مار''

اس سے پہلے پاکٹ مار کے پٹنے کا ایک دو واقعہ اس نے دیکھا تھا۔ آنکھوں میں

اندھیرا چھانے لگا۔ مگر ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے بھاگ جانا چاہا۔ اسے سڑک پر نکل جانے میں عافیت نظر آئی ۔ دفعتاً بیوی کا متفکر چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔

اسی اثناء میں ۔ مارو ۔ مارو کی آواز پر کسی نے اس کے پیٹ میں ایک گھونسا جما دیا۔ پھر کیا تھا۔ سبھوں نے گھیر لیا۔ سامنے کا دکاندار دوڑا آیا۔ مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے تمسخر سے بولا۔ ''اپن کو لفڑا نہیں مانگتا۔ آگے بڑھو۔'' شور اور گہرا ہو گیا۔ ''مارو ——— مارو'' اس پر تھپڑ اور گھونسوں کی بارش ہونے لگی۔ اس نے پھر اپنی کوشش جاری رکھی ۔ بدن کسمساتے رہے لیکن ناکام ہو گیا —— لوگ بڑی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ سامنے کے دکاندار کو بازار بند ہو جانے کی فکر تھی ۔ وہ چیخا —— ''ٹھہرو ۔ ٹھہرو —— مت مارو ۔ ہے کون؟''

''پاکٹ مار ہے'' کسی نے مستحکم لہجے میں وضاحت کی ۔

ایک دکاندار نے چیخ کر کہا۔ ''بھاگ جائے گا۔ سالے سے پہلے پیسہ نکالو۔''

لوگوں کا زور کچھ کم ہو گیا —— ''ٹھہرو ۔ ٹھہرو۔'' کی آواز کے ساتھ سامنے والا دکاندار آگے بڑھا اور اس نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ دو چار روپے اور ایک چھوٹی سی مالا نکلی ۔ ''کس کا مارا ہے؟ چور سالا''

''مالا نہیں ہے یہ .... میں چور نہیں ہوں۔'' مار کھانے والے شخص نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا۔

''پاکٹ مار تو ہو'' ٹھوکا لگاتے ہوئے اس نوجوان نے کہا۔ جس نے گلی میں سب سے پہلے اس کا راستہ روکا تھا۔

''نہیں میں شریف آدمی ہوں۔''

''شریف آدمی !! ابھی بتاتا ہوں۔ وہ جیب دکھا۔''

اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ماں کی بے چینی کا قطرہ سمندر بن گیا۔

—— اور پھر دوسری جیب میں اسی سامنے کے دکاندار نے ہاتھ ڈالا ۔ کاغذ کی پڑیا نکلی جسے کھول کر لوگوں میں اس نے دکھایا۔ پھر خوش ہو کر بول پڑا۔ جیسے اس کی کوئی گمشدہ چیز

مل گئی ہو—— ''دیکھو سالا۔ آتنک وادی ہے۔''

ہجوم کسی مہلت کے بغیر پھر ٹوٹ پڑا۔ گھونسے۔لات۔بلٹ۔ جس سے جو ہو رہا تھا۔ برسا رہا تھا۔ شور اور بڑھ گیا۔ مارو سالے کو۔ خلاص کر دو۔''

شور سن کر گلی میں لوگ امڈتے چلے آرہے تھے۔ دور سے دیکھنے پر ایسا لگ رہا تھا جیسے شہد کی مکھی کا چھتا گر گیا ہے—— شور اور گردش۔ ہر آدمی کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔ دور کھڑے لوگوں کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ واقعہ کی نزاکت کو جاننے کے لئے کسی نے کسی جانے پہچانے آدمی کو پیچھے سے آواز دی۔

''......کون ہے رہے؟''

بھیڑ میں ایک نوجوان کی گردن اونچی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں بلٹ جھولنے لگا۔ سامنے نظر دوڑائی۔ تھوڑا مسکرایا۔ جواب میں چہکا——

''آونا۔''

''کون ہے رے؟''

''اسی کا آدمی ہے۔''

''مارو سالے کو۔''

صریر - ستمبر ۱۹۹۴ء
کراچی

مرگھٹ میں جگنو

''آؤ کچھ دور اور چلتے ہیں۔''

''اب کہاں تک جائیں گے؟''

''بس چلتے چلیں —— اسی طرح۔ ساتھ ساتھ۔ خاموش —— دیکھو کتنی اچھی ہوا چلنے لگی ہے۔''

''ہاں۔ ہوا اچھی چل رہی ہے۔ تازہ تازہ۔''

''چلو چلتے ہیں۔ اس پیڑ کے نیچے۔''

''میں تو تھک گئی۔''

''تھک تو میں بھی گیا ہوں لیکن آؤ نا —— دیکھو پیڑ کے نیچے کتنی اچھی ہوا ہے۔''

''جی چاہتا ہے۔ یہیں رہ جائیں۔''

''ٹھیک کہا انجو تم نے۔ آؤ کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔''

''بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ ہوتی؟ میرا مطلب ہے بینچ وغیرہ۔''

''بینچ کیا ہوگا؟ —— دیکھو یہ نیچر کا بنا ہوا بینچ، درخت کی یہ جڑیں۔ دیکھو یہ بالکل کرسیاں ہیں۔''

''آپ کو بھی کبھی خوب جھائی دیتا ہے —— کرسیاں!''

''تمہیں نہیں لگتا۔ ہمارے پروجوں نے یہیں کہیں......''

''اور ہم؟''

''ہم پل دو پل کے لئے بیٹھ تو سکتے ہیں۔ بیٹھو نا۔''

''نہیں۔ آپ بیٹھئے۔''

''یہ کیا، آپ آپ لگا رکھا ہے۔ گھر میں بھی آپ آپ کی گردان اور باہر بھی۔''

''تو پھر کیا کہوں؟ تم کہہ کر مخاطب کروں۔''

''اور نہیں تو کیا؟؟ کچھ تو ماحول سے بھی متاثر ہوا کرو۔ بیٹھ جاؤ۔''

''نہیں۔''

''اچھا لو۔ میں بیٹھ جاتا ہوں —— اور تم؟ —— تم ہماری گود میں بیٹھ جاؤ۔''

''چھی۔''

''چھی، کی کیا بات ہوگئی؟ اچھا آؤ۔ لو جگہ بن گئی'' —— دونوں ساتھ بیٹھ گئے۔

''انجو تمہیں کیا لگتا ہے؟ پتوں میں ہواؤں کا یہ رقص۔ اور یہ موسیقی؟''

''اور ڈوبتے سورج کی روشنی؟''

''جیسے تمہارے چہرے کے گلاب۔''

''میں نے تو کوئی میک اَپ بھی نہیں کیا۔''

''تم تو خود ہی گلاب ہو۔''

''دھت —— چھوڑو نا۔''

''کیوں؟''

''ای —— چھوڑو نا —— اُد —— تم کو میری چوٹی اچھی نہیں لگتی؟''

''اچھی کیوں نہیں لگتی!''

''تو بار بار کھینچتے کیوں ہو؟ کٹوادوں؟؟''

''کٹا بھی سکتی ہو، لیکن ماں۔ ماں کیا کہے گی؟''

''تم سمجھنا۔''

''اچھا میں سمجھوں! انجو —— انجو ماں تمہیں بہت مانتی ہیں۔ تم ہو بھی اچھی —— بالکل ویسی —— تمہارا ہاتھ۔ دیکھو کتنا نرم ہے۔ بالکل تمہارے مزاج کا ترجمان —— تمہارے ہونٹ، لگتا ہے ابھی ابھی کوئی کلی چٹکی ہے اور یہ —— رس بھرے...... انجو۔ تم بہت اچھی ہو —— انگ انگ سے —— لذتِ بے کراں۔ انجو''

''کیا؟ —— دیکھو میری ساڑی چور ہو رہی ہے۔''

''انجو۔''

''کیا؟''

''انجو۔''

''چھوڑو بھی —— گھر چلو —— اب چلو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''ڈر کس کا؟ ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

''تم نہیں سمجھتے۔ زمانہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں کوئی تمہیں بھگا کر لایا ہوں؟ ارے تم میری دھرم پتنی ہو۔''

''اس سے کیا ہوا، کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ چلو نا —— رات ہوگئی۔ دیکھو بارش بھی ہوسکتی ہے۔''

''اچھا ہے۔ ہم ساتھ ساتھ بھیگینگے۔''

''نہیں۔ نہیں۔ چلو، ماں انتظار کر رہی ہوں گی —— میں تھک بھی گئی، مجھے کام بھی ہے۔''

''کیا کام ہے؟''

''گھر چل کر بتاؤں گی۔''

''چلو گھر چل کر ہی بتانا۔ چلو۔ لیکن تمہیں کوئی مدد نہیں دے سکتا۔ گھر جا کر سیدھا باتھ روم —— شاور کھولوں گا۔ جی بھر کے نہاؤں گا پھر تم ایک پیالی کافی پلا دینا۔ اور دیر گئے رات تک مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔ سیر ہو کر گیت غزلیں سنوں گا۔ پھر تمہاری جیسی مرضی۔''

''—— عجیب حال ہے —— کہاں کھو گئے ہو؟؟ کہاں کھو جاتے ہو؟؟ گھنٹوں؟؟؟''

''کیا —— کچھ کہا تم نے؟؟''

''میں کہہ رہی تھی۔ روز کل کل کرتے ہو۔ اب تو پانی بھی نہیں نکلتا۔''

''ہاں۔ ہاں۔ واشر اَب بدلنا پڑیگا۔''

''بدلنا ہی پڑے گا۔ ابھی بدلواؤ۔ دیکھو تو سنہا صاحب کا ٹیوب ویل، کتنا پانی گرتا ہے —— نہانا، دھونا، کھانا پینا سب ...... پریشان تو میں ہوتی ہوں۔ اور دیکھو بازار سے کراسن تیل بھی لے لینا۔''

''کراسن تیل ملتا کہاں ہے؟ وہ تو میں نے بڑی خوشامد سے بلیک میں لیا تھا۔''

''تو بازار سے موٹی موٹی تین چار موم بتی ہی لے لینا۔ دو دنوں سے بجلی ہے نہیں۔ آخر کچھ تو جلے گا۔''

''موہن۔ موہن''

''کون ہے؟''

''ماں جی آداب۔ میں برجیش۔''

''جیتے رہو۔ کب آئے؟''

''ماں جی موہن کہاں ہے؟''

''دیکھونا۔ آنگن میں دو گھنٹے سے اکیلا بیٹھا ہے۔ جانے کیا کیا سوچتا رہتا ہے۔''

''اب آپ اس کی شادی کر دیجئے۔''

''وہ تو تم لوگ ہی کراؤ گے۔ بڑے بھائی ہو۔ دوست ہو۔''

''ہاں۔ ہاں۔''

''لیکن بیٹا —— موہن تو راضی ہوتا ہی نہیں۔''

''کیا بولتا ہے؟''

''یہی کہ جب تک نوکری نہیں ملے گی۔ شادی نہیں کروں گا۔''

''ٹھیک ہی کہتا ہے۔''

''آخر کب تک نہیں ملے گی؟ کیا کیا بولتا رہتا ہے۔''

''اب دیکھئے نا ماں جی۔ نوکری کیا ملے گی۔ اس بندر بانٹ میں۔ سب طرف مایوسی ہی مایوسی ہے۔ کوئی کام نہیں ہو رہا ہے، سب ڈیولپمنٹ بند ہے۔''

''کیا سب کام بند ہو گیا ہے؟ —— سنسار کیسے چلے گا؟''

''بند کیا ہو گا۔ سب اپنے اپنے لوگوں کو......

تو کچھ کوشش پیروی کرو۔ دیکھو شاید۔ اب تو بڑے انجینئر ہو گئے۔ آؤ نا۔ اندر آؤ۔

ماں کے ساتھ برجیش گھر کے اندر آ گیا۔ سلسلۂ گفتگو برقرار رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

''آپ لوگوں کی دعاؤں سے پرموشن تو ہو گیا ہے۔ اب دیکھتے ہیں۔ کوئی راستہ نکل جائے گا۔ لیکن اب اس کی شادی ہو جانی چاہئے —— کچھ تو لڑکیاں لاتی ہیں اور کچھ

لڑکیوں کی تقدیر سے بھی آتا ہے۔''

''بیٹھونا۔ کھڑے کیوں ہو۔ موہن کو بلا کر لاتی ہوں۔''

''موہن——''

''..........''

''او موہن —— جانے کیا سوچتا رہتا ہے؟——''

''اف فوہ —— کیا ہے ماں——''

''چلو نا —— وہ کمرے میں بیٹھا ہے۔''

''کون —— ؟ لکھن —— مجھے نہیں ملنا کسی سے ——''

''تو جا کہاں رہا ہے اور کون لکھن سمجھ کر بھاگا جا رہا ہے۔ وہ تو برجیش......''

''کوئی رہے میں کسی سے نہیں ملوں گا——'' پھر وہ باہر نکلتے ہوئے بڑبڑایا——

''شادی کرلو —— دوسرے کے دھن پر گرہستی شروع کرو —— اور جو ختم ہو جائے تو —— تو

پھر —— بیوی —— بٹائی دار کہیں کا——''

صریر- جنوری ۱۹۹۴ء

کراچی

پہلی اینٹ

ساریکا بھی آج کمر کس کر بیٹھی تھی۔

دو چار ماہ سے وہ ٹالتا ہی جا رہا تھا مگر اس نے بھی ٹھان لی تھی کہ اپنی بات منوا کر ہی چھوڑے گی۔ آج اس نے کھانے میں کافی اہتمام بھی کیا تھا۔ بڑے جتن سے اس نے گڑ بھر کر کریلے کی سبزی بنائی تھی۔

گڑ دار کریلا وہ بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ ساریکا کو یقین تھا کہ بیوی کے ہاتھوں کا بنا ہوا من پسند کھانا کھاتے ہوئے مرد جو وعدہ کرتا ہے اس سے جلدی نہیں مکرتا۔

کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے اس نے تھوڑا کریلا چکھا اور مسکرا کر ساریکا کی طرف دیکھا۔ ساریکا بھی جواباً مسکرائی۔

''کیسا بنا ہے؟''

''تمہارے ہاتھ میں جادو ہے۔''

''آپ غلط بیانی کر رہے ہیں۔''

''سچ کہہ رہا ہوں۔''

''پریشر کو کر لانے کے لئے بھی آپ کب سے کہہ رہے ہیں۔''

''لا دوں گا۔''

''آج ہی لا دیجئے کتنی ساری چیزیں......''

''لا دوں گا بھئی، اس بار لا دوں گا۔''

''اب تو ایندھن کا بھی پیسہ بچ رہا ہے۔ اس ماہ سے تو بجلی کا بل بھی......''

''اچھا۔ اچھا۔'' اس نے گردن ہلا کر سار یکا کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

سار یکا پھر بول پڑی۔

''بجلی مستری کو بھی جلدی پکڑیئے سبھوں کے یہاں اچھا انتظام ہے اور یہاں بے ڈھنگا۔ مستری تار لگا دے گا تو خطرہ نہیں رہے گا۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے...... یہ نیا میٹر بھی عجیب ہے۔''

''ہاں۔ ہاں۔ مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔ فرصت ملے جب نا۔''

کھانا کھانے کے بعد اس نے کپڑے بدلے اور دفتر کے لئے روانہ ہونے لگا تو بلو نے سائکل پر سوار ہونا چاہا۔

''اف۔ او۔'' اس نے بلو کو الگ کرتے ہوئے سائیکل سنبھالی۔

''دیکھیے بھولئے گا نہیں۔'' سار یکا نے پھر یاد دلایا۔

''نہیں بھولوں گا بھئی۔'' اس بار جیسے کچھ عاجز ہو کر اس نے کہا۔ اس کے جانے کے بعد سار یکا نے دروازہ اندر سے بند کیا اور پلنگ پر لیٹ گئی۔

''ماں۔ ماں دیکھو اخبار میں کیا ہے؟'' بلو اخبار لے کر پلنگ پر آ گیا لیکن سار یکا کسی اور خیال میں گم تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ محلے والے کتنے عقلمند ہیں۔ سب نے میٹر میں الگ تار لگا رکھا ہے اور کسی کو خبر نہیں۔ سار یکا کو یہ سوچ کر افسوس ہوا کہ یہ بات اس کو پہلے کیوں نہیں سوجھی۔ یہ لوگ کب سے بجلی کا خرچ بچا رہے ہیں۔ اور اس کی نیند اب ٹوٹی۔ ان

لوگوں نے کافی پیسے بچائے ہوں گے۔ خیر وہ بچائیں ہم تو ہر ماہ گھر میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر لیں گے۔ مختصر سے وقفے کے لئے اس کی آنکھیں جھپک گئیں۔

پھر وہ بستر سے اٹھ کر اچانک آنگن میں آئی اور تار پر پڑے کپڑے اٹھانے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ کپڑے ابھی گیلے ہیں مگر پھر بھی اس نے انہیں سمیٹا اور سامنے میز پر ڈھیر کر دیا۔ جب کہ دھوپ کے کس بل میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی۔ پھر وہ کمرے میں گئی اور جب باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں آئرن تھا۔ آئرن کو گرم ہونے کے لئے چھوڑ کر وہ کپڑوں پر پڑی شکن کو دور ہی کر رہی تھی کہ کسی نے باہر دستک دی۔ ساریکا چونکی۔ شاید وہی ہے۔ دروازے پر دستک پھر ہوئی تو ساریکا کو یقین ہو گیا کہ میٹر ریڈر ہی ہے۔ دستک دینے کا انداز وہی تھا۔

''کون؟'' یہ کہہ کر ساریکا دروازے کے پاس پہنچی اور ایک بار پھر بول پڑی۔ ''کون ہے؟''

''میٹر دیکھنا ہے۔'' باہر سے کسی مرد کی آواز آئی۔

اس سے قبل بھی وہ دو بار آ چکا تھا لیکن ساریکا نہانے دھونے کا کام کر رہی تھی اور گھر میں کوئی مرد بھی نہیں تھا۔ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ آج آ دھمکے گا۔ ابھی وہ اس کو واقعی ٹالنا چاہتی تھی لیکن کوئی بہانہ سوجھ نہیں رہا تھا۔ کواڑ پر کھڑی کھڑی بہانے ڈھونڈتی رہی۔ تب اس کو اپنے شوہر پر غصہ آ گیا۔ اس نے کئی بار پوچھا تھا کہ تار باہر نکالنے کی ترکیب اس کو سمجھا دے لیکن وہ ہر بار عجلت میں ہوتا تھا اور وہ اس حکمت سے واقف نہیں ہو سکی تھی کہ کس طرح میٹر میں الگ سے تار لگا کر بجلی گھر کے اندر دوڑائی جاتی ہے اور میٹر پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور پھر کس طرح تار کو الگ کر دیا جاتا ہے کہ میٹر ریڈر کچھ بھانپ نہیں سکے۔

وہ خاموش کھڑی کھڑی واپس لوٹ گئی۔ لوٹ کر آنگن میں ایک پل رکی اس کے رخسار پر سورج کی کرن پڑنے سے ننھے ننھے ہیرے کے کن جگمگانے لگے۔ بلو اس کو دیکھ کر آنگن میں چلا آیا اور ساڑی کا پلو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ماں کو خاموش دیکھ کر بولا۔

''ماں کوئی آیا ہے۔''

سار یکا نے جواب نہیں دیا۔ ببلو نے اس کا پلو پکڑ کر کھینچا۔

''ماں۔ اسے بلا لوں؟''

''چپ۔'' ساریکا نے ببلو کو جھڑکا اور پھر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''وہ آ گیا تو سب گڑبڑ ہو جائے گی۔''

پھر اچانک اس کو پڑوسی کا خیال آیا۔ وہ آنگن کے عقبی دروازے کی طرف لپکتی ہوئی گئی۔ ببلو کسی دمدار پتنگ کی طرح اس کے ساتھ ہو گیا۔

ساریکا نے پڑوسن کے آنگن میں قدم رکھتے ہی پوچھا۔

''بھائی صاحب ہیں۔''

''نہیں۔'' پڑوسن کی لڑکی نے جواب دیا۔

ساریکا ایک ذرا سا مڑنے کے انداز میں ہلی مگر پھر رک گئی۔ اس نے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک آس تھی۔ جو ڈوبتے ہوئے آدمی کی آنکھوں میں ساحل پر کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش رہی۔ پھر بولی۔

''دیکھو نا۔ ببلو کے پاپا تو ہیں نہیں اور میٹر ریڈر آیا ہوا ہے۔ میں تو میٹر سے تار الگ کرنا جانتی ہی نہیں۔ نہ جانے آگ لگ جائے یا کیا گڑبڑ ہو جائے۔''

''ہاں بڑی ہوشیاری کا کام ہے۔'' نرم لہجے میں ہمدردی جتانے کے لئے پڑوسن نے کہا۔

ساریکا کو بات بگڑتی نظر آئی مگر تھک ہار کر وہ بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ ملتجیانہ نگاہوں سے اس نے پڑوسن کی لڑکی کی طرف دیکھا اور نہیں چاہتے ہوئے بھی خوشامدانہ لہجے میں بولی۔

''تمہیں چل کر کچھ کرو نا۔ الگ سے تار لگا ہوا ہے۔ میٹر والا اندر آ گیا تو سب گڑبڑ

ہو جائے گی۔''

''یہ کیا کرےگی۔اس کے پاپا رہتے تو کر بھی دیتے۔'' پڑوسن جلدی سے بولی اور بیٹی کو گھورنے لگی۔

سارِیکا آنگن میں واپس آئی بھی نہ تھی کہ پلٹی اور دس قدم چل کر دوسرے پڑوسی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔اس کی دستک پر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے پھر دستک دی اور اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا تو اسے یاد آیا کہ یہ لوگ آج صبح ہی سے وی سی آر لگا کر فلمیں دیکھ رہے ہیں۔ایک تو سنیں گے نہیں اور سنا بھی تو دروازہ کھولنے سے رہے۔

سارِیکا بوجھل قدموں سے آنگن کی طرف لوٹنے لگی۔اس کا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا تھا۔سانسیں کچھ تیز ہو گئی تھیں۔اس کی ساڑی بار بار ٹخنے کے نیچے الجھ رہی تھی۔جس کی اسے کچھ پروا نہ تھی۔ بلو سے اس نے اپنی ساڑی ایک جھٹکے کے ساتھ چھڑائی اور آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے آنگن میں پہنچی۔اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ خاموش ہو جائے لیکن وہ خاموش ہونا نہیں چاہتی تھی۔آخر بجلی والا کیا سمجھے گا۔کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لائن ہی کاٹ دے۔

اس کے دل میں طرح طرح کے خیال آتے رہے۔ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ وہ اب دھڑتے سے بجلی کا استعمال نہیں کر سکے گی۔تب اس کو گھر کی نئی نئی ضرورتوں کا خیال آیا اور وہ جیسے تھک کر آنگن میں بیٹھ گئی۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی اس نے ایک لمحے کے لئے دروازے کی طرف دیکھا۔یکایک اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری۔وہ اٹھی اور ایک لمبی سانس لی اور اپنے اندر ڈھیر ساری ہوا بھر کر اپنے پلّو کو کمر میں اڑس لیا۔پھر میٹر کے قریب آئی ایک لمحے کے لئے میٹر کو دیکھا اور میٹر اور تار کے رشتے کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر ذرا سا رکنے کے بعد یکایک اپنے ہاتھ چھت کی طرف اٹھائے۔انگلیوں کے ساتھ اس کی ہتھیلی نے بھی میٹر کے نیچے سے نکلے ہوئے تار کے لمس کو محسوس کیا اور تب اس نے یکایک ایک زور کا جھٹکا دیا۔تار میٹر سے

نکل کر ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ ساریکا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میٹر پر ایک نظر ڈالی پھر ساڑی کے پلو سے چہرہ پونچھنے لگی۔

بلو جواب تک پتنگ کی دم بنا سارا کچھ دیکھ رہا تھا، اچانک آنگن کی فضا میں لہرانے لگا۔ ساریکا کو تو اس کا خیال بھی نہ رہا کہ وہ کب اس سے کٹ کر آزاد ہوا میں تیرنے لگا۔ لیکن آنگن سے آتی ہوئی اس کی آواز صاف سنی۔

''جاتے ہیں اس کو بلانے کہیں گے تار کھول دیا گیا ہے۔''

اس کے وجود میں بجلی دوڑ گئی۔ بے تحاشا دوڑی اور ایک ہی جست میں بلو کو جالیا۔ جیسے کسی بھیڑیے نے خرگوش کو دبوچ لیا ہو۔ پھر اس کے بازو کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے ایک زوردار طمانچہ رسید کیا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ پھر اسے گھسیٹتی ہوئی کمرے میں لائی اور باہر نکل کر کنڈی چڑھا دی۔ کمرے سے بلو کے رونے کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی۔ ساریکا پھر تیز تیز قدموں کے سہارے پلک جھپکتے ہی دروازے پر پہنچی اور کواڑ کھولا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے دو چار قدم باہر نکالے، ادھر اُدھر دیکھا مگر گلی دور تک سنسان تھی۔

آنچل - ستمبر ۱۹۹۱ء

کراچی

کیکر کے پھول

جب کوئی برتن بچپن میں ہاتھ سے چھوٹ کر جھنا نک سے بولتا تو اس کے لب پھیل جاتے۔

ندی کے کنارے اپنے مکان کی چھت سے برسات میں بہتے ہوئے جھونپڑوں اور جان مال دیکھ دیکھ کر وہ خوشیوں سے اچھلتا، شور مچاتا۔ ایسے میں اس کی ماں اکثر اس کو چھت پر بھاگتے ہوئے پکڑ ہی لیتی اور ہاتھ میں جو کچھ بھی ہوتا اس سے دے مارتی۔ تب کئی بار باپ نے ماں کو ڈانٹا ڈپٹا تھا تلخی بڑھی تھی۔

بورڈنگ میں اس کو بھیجنے کا فیصلہ لے کر باپ نے اپنی ازدواجی زندگی کو تلخ ہونے سے بچالیا تھا۔ مبارک علی اپنی بستی سے دور دریا کی کل کل سے بچھڑ کر شہر میں موٹر گاڑیوں کی گھر گھر سے قریب سڑک کنارے چوراہے کے نزدیک ایک کمرے میں رہنے لگا تھا۔ بستی یہاں سے شروع ہوتی تھی۔ بستی کے اس نکڑ پر مبارک علی اپنے بورڈنگ جیسے اسکول میں پڑھنے لگا تھا --- روزانہ شام کو ایک آدھ گھنٹہ کے لئے چوراہے پر آنا اس کے معمول میں

تھا۔ تب بستی سے باہر آنے جانے والوں سے صاحب سلامت ہوتی اور اس طرح آہستہ آہستہ اس کے گرد ہم خیالوں کی ٹولی بن گئی تھی۔ گھر چھوٹنے کا دکھ کسی قدر دھیرے دھیرے دھندلا ہو گیا تھا۔

گھر سے دور آئینے میں جب بھی اپنا چہرہ دیکھتا تو اس کی ٹھڈی پر کٹے کا نشان اس کی ماں کی یاد دلا کر اس کو شرمندہ کر دیتا ـــــــ اپنے بڑے بھائی کے امتحان کے دنوں میں نوٹس بک چرا کر چپکے سے گائے کے بتھان میں اس نے اسلئے پھینک دیا تھا کہ اس کا بڑا بھائی فیل کر جائے تو بھائی کو اپنے امتحان سے زیادہ اس اپنے نوٹس بک کی فکر ہوئی تھی۔ سارا گھر سر پر اٹھائے اس نے آخر کار نوٹس بک تلاش کر لی تھی اور مبارک علی کے لگائے گئے الزام سے بڑے بھائی کے دوست کی حیثیت اس گھر میں تین کوڑی کی ہوتے ہوتے بچ گئی تھی۔ تب ماں نے بھرا گلا اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ زخم تو جلد ہی بھر گیا۔ مگر مبارک علی اس واقعے کو بھول نہ سکا۔

آج بھی آئینے میں اس کا بھائی، بھائی کی نوٹس بک، اس کا دوست اور پانی سے بھرا پیتل کا گلاس اس کی ٹھڈی کے داغ پر تہہ بہ تہہ منظر اور پس منظر کی شکل میں یادوں کے دھندلکوں سے نکل کر اس کے سامنے آجاتے۔ ایک مدت تک ان باتوں سے وہ لرزتا رہا۔ مگر آہستہ آہستہ اس کے اندر سب کچھ معمول پر آگیا تھا اور تب ہنسنے اور مسکرانے کا سامان اس نے دوستوں اور قریبی لوگوں میں تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔

کلوا، اس کے گھر کا نوکر، گھر سے جب بھی چنے کا ستو دہی کی کڑاہی اور گاجر کا حلوا لے کر آتا تو یہ کلوا کے سامنے ساری چیزیں چپڑ چپڑ کھاتا اور کلوا منہ میں زبان گھماتے گھماتے واپس گاؤں لوٹ جاتا۔

مبارک علی نے محنت سے زندگی میں بہت کچھ حاصل کیا۔ اچھی تعلیم اچھی نوکری اور اچھے دوست۔ تعلیم کے لئے بہتوں سے بلا امتیاز عمر و رتبہ راہ و رسم اختیار کیا۔ نوکری اس نے کبھی بدلی نہیں۔ ہاں دوست اس کے ادلتے بدلتے رہے۔ اس کا ہر دوست اس پر جان

چھڑکتا۔ دوستی کا دم بھرتا۔ تب اندر ہی اندر مبارک علی خوش ہوتا۔ مبارک علی اس لئے خوش ہوتا کہ اس نے کسی کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی تھی۔ دوست احباب کا آنا جانا لگا رہتا اور لگا رہے اس لئے اس نے اسکول کے زمانے سے ہی مہمان نوازی میں نام کمایا تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ جب منہ کھاتا ہے تو آنکھ شرماتی ہے اور شرماتی ہوئی آنکھوں میں جھانکنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہر ایک سے اس کا دکھ درد پوچھنا اور رنج وغم کے معاملے پر سنجیدہ ہو جانا اس نے خوب سیکھا تھا۔ مگر سب سے الگ ہو کر رات اپنے کمرے میں تنہا شراب انڈیلتے ہوئے اکثر اس کا قہقہہ لگاتے ہوئے دوستوں کا نام لے کر یہ کہنا کہ گرا سالا، بڑا اکڑفوں کرتا تھا۔ مدنواں..................ہی ہی ہا..................ہی ہی ہا......''

مدن کی طرح رمضان علی بھی اس کا دوست تھا۔ رمضان علی جب اپنی بیوی میں دلچسپی نہ لے پاتا تو شراب میں ڈوب جانے کے لئے اس کے گھر آ جاتا —— دارو شراب کی ساری اچھی اور قیمتی بوتلیں رمضان علی کی وجہ سے اس نے پہلی بار دیکھی تھیں۔ مغل منارک —— وڈکا —— اور —— کبھی کبھی میکڈونالڈ —— رمضان علی کے شوق سے اس نے بڑے فائدے اٹھائے۔ رمضان علی محبت کا بھوکا تھا، جس شہر میں بھی جاتا مبارک علی کو نہیں بھولتا۔

رمضان علی نے اپنے بیگ سے نکال کر سامنے ٹیبل پر ڈبہ رکھتے ہوئے کہا ——
''ابھی موبائل آپ کے شہر میں نہیں آیا ہے...... اچھا لگا، خوبصورت سا دکھ رہا تھا، سوچا یہ تحفہ آپ ہی کو دیا جا سکتا ہے۔'' کبھی رمضان علی اپنی بند مٹھی مبارک علی کی ہتھیلی پر رکھ کر خندہ پیشانی سے پوچھتا —— ''کیا ہے۔ بتایئے؟'' تب مبارک علی ہنستا تھا۔ ''ہی ہی ہا............ ہی ہی ہا............'' اور جب رمضان علی نے اپنی مٹھی کھولی تو مبارک علی کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی پر جڑا سات رتی کا پکھراج دمک اٹھا۔ اپنی دیرینہ خواہش کے اچانک پورا ہونے پر مبارک علی ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔

چھوٹی موٹی خوبصورت اور قیمتی چیزیں رمضان علی اکثر مبارک علی کو تحفہ میں دیتا اور مبارک علی بڑی محبتوں سے ہر ایک سامان کے ساتھ کوئی کہانی گڑھ کر ملنے ملانے والوں

میں ایسا سنا تا جیسے اس نے ان چیزوں کی فراہمی میں دل کھول کر پیسے خرچ کیے ہیں۔ تب اس کی دھاک جم جاتی اور سامنے بیٹھے لوگوں کے چہرے پر جو رنگ آتا جاتا وہ مبارک علی کی آسودگی کے لئے ایک خزانہ ثابت ہوتا۔

رمضان علی کو اچانک دیکھ کر مبارک علی خوش ہو گیا۔ بڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تب بات کی تہہ میں غوطہ لگانے کا اس کا شوق ایک دم ابھر گیا۔

''—— آنے کی خبر کر دیا ہوتا رمضان بھائی۔''

رمضان علی سوال بن کر بولے——

''کیا آپ کے گھر بھی خبر کر کے آنا ضروری ہے۔ پہلے بھی......''

''مبارک علی اپنی مخصوص ہنسی ہنسا۔ ہی ہی ہا......ہی ہی ہا......''اس نے پھر اپنی بے معنی ہنسی میں کچھ معنی ڈال کر کہا——

''بات یہ ہے کہ اگر آپ خبر کر دیتے تو میں آپ کو لینے اسٹیشن آجاتا۔'' رمضان علی کے تیور بدل گئے۔

''کبھی لینے آئے ہیں کیا؟''

رمضان بھائی—— آپ کو پتہ ہے میرا باہر جانے کا پروگرام بن رہا ہے۔ ہو سکتا ہے میں باہر بھی چلا گیا ہوتا۔ فون کر کے آنے کی خبر دینے میں کیا قباحت تھی؟'' رمضان علی نے سوچا کہ وہ ضبط سے کام لے۔ لیکن یکایک بول پڑا۔ ''فون کیا نہیں؟ اپنی بیگم سے پوچھ لیں۔ آداب سلام کے بعد بات کہاں ہوئی اور پھر لگاتے رہ گئے۔ انگیج ملتا رہا......ادھر تو گھنٹی بھی بجتی تھی مگر اٹھانے والا نہ تھا کوئی۔ پتہ نہیں ...... آپ لوگ ......''

''ہاں۔ ہاں'' مبارک علی جلدی سے بولنے لگا۔ ''میرا فون خراب ہو گیا تھا۔ آج ہی تو ٹھیک ہوا ہے۔''

اور مبارک علی من ہی من میں قہقہہ لگانے کے موڈ میں آگیا—— ہی ہی ہا......اس کے رخسار کھلے، پیشانی کشادہ ہوئی، اور ہونٹ ہلے، مگر اس نے من ہی من میں قہقہہ نہیں لگایا

اور ''اچھا۔اچھا۔''بول کر خاموش ہو گیا۔

مبارک علی کے قریبی دوست گھنشیام نے جب سے تیل نکالنے کا جدید طرز پر کارخانہ قائم کرنے کا کام شروع کیا تھا، مبارک علی بہت مصروف ہو گیا تھا۔ دوست کے مِل میں چار آنہ کا شیئر ہولڈر بن کر اس نے اپنے آپ کو آن کی آن میں بڑا آدمی محسوس کر لیا تھا اور مِل کے شروع ہونے کا سارا کام کاج اپنے سر لے لیا تھا۔ رات رات بھر مختلف مشینوں کی کمپنیوں کے کاغذات پھیلا کر الگ الگ مشینوں کی جزیات کو سمجھتا جانتا رہتا۔ سرکاری اداروں میں اپنے مراسم سے زمین خریدنے کی جستجو اور مِل بٹھانے کی پرمیشن تک کے سارے کام بڑی تندہی سے کرتا۔ اور اس بیچ ملنے ملانے والوں سے گفتگو کا موضوع یہی کارخانہ ہوتا جسے چھیڑ کر ساری جزیات سامنے رکھتا۔ مِل کی آمدنی اس پر لگنے والے اثاثے سے لے کر اس کے چل جانے کے دعوے پر ایک مشاق تاجر کی طرح اپنے علم کا سکہ جماتا۔ تبھی کئی دوستوں کے دہانے کھل جاتے اور ان کے دامن پر کھلے ہوئے منہ سے رال کے دو تین قطرے ٹپک کر جذب ہو جاتے اور آنکھوں میں چمکتے بجھتے ہوئے ستارے نظر آتے۔ تب مبارک علی یہ محسوس کرتا کہ وہ ایک اونچا پیڑ ہے، پھل سے لدا ہوا اور اس کے نیچے زمین پر بہت سے بونے اس کا طواف کرتے ہوئے منت وسماجت کے ترانے گنگنا رہے ہیں——

بھیا ہو بھیا رنگ رسیلے بھیا

تم ہی ہمارے میاں بیا تم ہی ہماری گیا

بھیا ہو بھیا..............

پھر اس کا دہانہ کھلنے اور بند ہونے کے بیچ کئی شکل بناتا اور اندر وہی، ہی ہی ہا۔ اور ہونٹوں پر امنڈتی ہوئی مسکراہٹ جس کو دبانے کے لئے کسی نہ کسی کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے کسی عزیز کی خیریت پوچھ بیٹھتا—— ''کیا بھئی—— ابا کیسے ہیں؟'' اور پھر کوئی دوسری بات چھڑ جاتی۔

رمضان علی فون کی بات سے فوراً اپنے موضوع پر آ جانے سے گریز کرنا چاہتا تھا۔

لیکن اس نے یہ بھی سوچا کہ آخر ہم اپنے دوست کے پاس بھی کھل کر نہیں بول سکتے تو ......معاملہ میرے بھتیجے کا ہے۔ ہم کسی ایرے غیرے...... یکا یک گھڑی دیکھ کر اس کو یاد آیا کہ اس کا بھتیجا تو اب ہوٹل پہنچ گیا ہوگا —— سلیم اس کا بھتیجا اپنے شہر سے انٹرویو دے کر شام کی گاڑی سے آنے والا تھا۔ مبارک علی سے فون پر بات نہ ہونے پر رمضان علی جلد مل کر بات پکی کرنے پہلے چلا آیا تھا۔ اس کی بستی کے گھنشیام جی کے رشتہ دار نے اس کو بتایا تھا کہ مِل اب جلد ہی چالو ہونے والا ہے۔ سلیم کو رمضان علی بہت عزیز رکھتا ہے۔ اس کا بس چلے تو نوکری کی تلاش میں سرگرداں سلیم کے ساتھ سالوں بھر شہروں شہروں انٹرویو کے لئے اس کے ساتھ جاتا رہے۔ بچپن سے سلیم اس کے اشاروں پر ناچتا رہا ہے۔ مبارک علی بھی سلیم کو خوب جانتے ہیں۔ جب جب وہ رمضان علی کے مہمان رہتے سلیم ان کی خدمت میں پل پل لگا رہتا۔ رمضان علی کو مبارک علی کا مہمان ہونا اچھا لگتا رہا ہے۔ بات پھر سے شروع کرنے کے لئے اس نے مبارک علی سے یوں ہی پوچھ لیا——

''باہر آپ کہاں جانے والے تھے؟''

مبارک علی نے باتوں کو آنکھوں سے ٹٹولتے ہوئے کہا—— کیوں، کہیں بھی۔'' اور پھر کچھ محسوس کر کے مسکراتے ہوئے بولا۔

''چلیں گے کیا؟''

''کہاں؟'' رمضان علی نے معصومیت سے پوچھا۔

''ارے بھئی'' مبارک علی نے تھوڑا اچھل کر سانس لی۔ ''ہم اب کہاں باہر بھیتر کرنے والے۔ ابھی مِل بیٹھ رہا ہے۔ بس مِل —— چوبیسوں گھنٹہ اسی کی کارروائی چل رہی ہے...... آپ جانتے ہیں میرے کام کرنے کا......''

رمضان علی کو لگا۔ یہی وقت ہے، مناسب موقع۔ پھر اس کے دل میں اچانک خیال آیا۔ معاملہ میرا ہے۔ میرے بھتیجے کا۔ اس میں وقت اور مناسب گھڑی کیا —— پھر اس کے سوچ نے ایک موڑ کاٹا ——

مبارک علی اب بڑا آدمی ہوگیا ہے۔اس کی ہنسی کا انداز —— پتہ نہیں —— تب ہی اچانک رمضان علی نے سکوت توڑا —— ''سلیم آگیا ہوگا۔کل صبح اس کو لے کر آتے ہیں۔''

''اچھا'' جیسے کوئی انہونی بات ہو۔مبارک علی کی آنکھیں چھوٹی ہوگئیں۔رمضان علی کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔اس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔پھر بولا۔''پرائیوٹ نوکری تو اپنے شہر کی ہی اچھی ہوسکتی ہے۔مگر یہ بھی تو اپنا...... سلیم بھی یہی چاہتا ہے۔اس کو تجربہ بھی ہے۔یہاں منیجر رہے گا۔تو..................

اس سے قبل کہ رمضان علی اور کچھ بولے۔مبارک علی نے آگے نہ سنتے ہوئے اپنے نوکر کو آواز دی۔''مراری۔'' مراری اندر آیا۔اس نے دوا کے دو پتے اور واپس آئی رقم کو ان دونوں کے بیچ صوفے کے سامنے ٹیبل پر رکھا ہی تھا کہ رمضان علی نے وقفے کا فائدہ اٹھانا چاہا۔

''سلیم بڑا محنتی......''

مبارک علی نے مراری کو جاتے ہوئے پھر پکار لیا۔اور جیسے مراری واپس آیا۔اس نے غراتے ہوئے کہا——

''ہر چیز کا وقت ہوتا ہے۔پیسے اٹھاؤ۔جب مانگوں تب دینا۔''

مراری تب آہستہ آہستہ سے ٹیبل پر پڑی ریز گاری اٹھا کر باہر نکل گیا۔اور مبارک علی نے رمضان علی کو مخاطب کیا۔''اچھا رمضان بھائی۔''

اشارہ پاتے ہی رمضان علی صوفے سے اٹھا تھا کہ مبارک علی کی بیوی آداب کرتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔مبارک علی نے اس کے لئے ذرا سا کھسک کر جگہ بنائی تو اس نے لمبے صوفے پر ایک کونے میں ٹک کر ساری کے پلو سے چہرے کا پسینہ خشک کرتے ہوئے کہا۔

''باہر ماسٹر صاحب کھڑے ہیں۔''

''تم نے ان کے پیسے تو دے ہی دیا ہے؟'' مبارک علی جاننے اور جتانے کے لہجے میں بولے۔

''ارے نہیں...... وہ مِل میں رہنے کی بات پر......''

مبارک علی مسکرائے اور اک ذرا گردن اونچی کرتے ہوئے بولے۔

''مِل تو کھلنے دو اور ہاں بچوں کو ٹھیک سے پڑھا رہے ہیں نا۔ سنو —— ان کو رات کے کھانے میں کچھ میٹھا بھی دیا کرو۔''

رمضان علی اس بیچ یوں ہی کھڑا رہا۔ اس کو لگا، شاید کوئی اس کو دوبارہ بیٹھنے کہے گا۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لئے اس نے جھک کر یوں ہی ٹیبل پر پڑی کتاب اٹھالی۔ اسٹیفن وولف —— ہرمن ہس —— کتاب کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ تبھی سامنے کی دیوار پر ایک گوریا پھڑ پھڑاتی ہوئی ایک مقام پر ہوا میں معلق ہو کر مکڑی کے جالے میں کچھ تلاش کرتی کرتی واپس کمرے سے باہر نکل گئی۔

مبارک علی کی بیوی نے صاف صاف جاننے کے لئے ہلکی اونچی آواز میں کہا ——

''کھانے وانے کا چھوڑیئے۔ اب وہ اپنی خود کی گرہستی کریں گے کہ...... ان کو مِل میں منیجر بنانے کا کیا ہوا؟''

مبارک علی نے جلدی سے کچھ چھپانے کی کوشش کی۔

''چھوڑو یہ سب۔ تم کو ان باتوں سے کیا۔ ماسٹر صاحب کو مِل منیجر بنائیں؟ پھر بچوں کو کون پڑھائے گا۔ دوسروں کے مقابلے میں ہم ان سے کام بھی نہیں لے سکیں گے۔ تم بھی کمال کرتی ہو...... چلو ابھی ان کو جانے کو کہو۔ اور ہاں.................. رات کے کھانے میں میٹھا..................''

رمضان علی کی موجودگی میں مبارک علی کی بیوی اپنی حیثیت پر سوالیہ نشان لے کر فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔ رمضان علی کو لگا کمرے میں حبس ہی حبس ہے اور مٹھی میں طاق ہونے سے بھی فرق نہیں پڑتا۔ باہر نکلنا چاہئے۔ تب رمضان علی پھر ملنے کا کہہ کر جانے لگا تو

مبارک علی نے اس کو مخاطب کیا۔

''بتایئے۔ گھر کا ماسٹر ہے۔ بچوں کو پڑھائے کہ......ہی ہی ہا......ہی ہی ہا۔'' باہر نکلتے ہوئے مبارک علی نے ٹیبل پر پڑا پیپسی کا خالی کین اٹھالیا۔ رمضان علی ہاتھ ملا کر جیسے رخصت ہوا اور مبارک علی نے خالی کین باہر کی طرف اچھال دیا۔ٹن-ٹن-ٹناک-سڑک پر جیسے ہی ڈبہ گراآتے ہوئے ٹرک نے اس کی رہی سہی صورت پر جیسے درمٹ چلا دیا۔

رمضان علی اپنے ہوٹل کے کمرے میں دیر رات گئے پہنچا تو سلیم سویا ہوا تھا۔اس کی آمد پر بھاری پپوٹوں کے اندر سے سلیم کی آنکھیں ایک ذرا چمکیں اس نے کچھ جاننے کا ارادہ کر کے رمضان علی کے پہلو میں اٹھ کر آنا چاہا۔ تب رمضان علی نے اچانک ہی اس کے آگے اس کا بایوڈاٹا رکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی کوئی گاڑی ملے گی؟''

اور اس کے منہ سے دفعتاً بے ترتیب سی آواز نکل گئی——ہی ہی ہا......ہی ہی ہا۔

الفاظ - جنوری جون ۲۰۰۲ء

علی گڈھ

راہِ نجات

کمار بابو کے تینوں بچے کتابیں پڑھ چکے تھے اور وہ اخبار کے اوراق الٹ پلٹ کر رہے تھے۔ بیگم نے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے کمار بابو سے کہا:

''چائے پی لیجئے۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

کمار بابو کے تینوں بچے اسکول کے طالب علم ہیں۔ پہلا لڑکا موہن دسویں جماعت کا ایک اوسط درجے کا طالب علم ہے۔ دوسرا راکیش اپنی بہن چمپا سے دو سال بڑا ہے مگر اس کے ساتھ پڑھائی میں قدم بہ قدم چل رہا ہے۔ یہ دونوں ساتویں جماعت کے طالب ہیں۔

کمار بابو نے چائے کی پیالی اٹھائی اور موہن کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولے:

''میر جعفر نے بھی تو سراج الدولہ کو دھوکہ دیا تھا، یہ تو قدرت کا نظام ہے۔ گیہوں بونے والا گیہوں اور جو بونے والا جو ہی کاٹے گا۔''

موہن کے پہلو میں بیٹھی چمپا، راکیش کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہہ رہی

تھی۔ ''جی-ائے۔''اور تیسرے سوال کا جواب نہ دے سکی تو اس نے راکیش سے کہا:

''دو۔ کتاب دو۔'' اور وہ سوال کے آگے درج جوابات کو پڑھنے لگی۔ بہار، بنگال، اڑیسہ۔''

''میں نے تمہیں تاکید کی تھی نا کہ تم کتاب پڑھو۔تم بار بار نوٹس لے کر کیوں بیٹھ جاتی ہو۔تم لوگ اس طرح پاس تو کرتے جاؤ گے مگر علم کی دولت حاصل نہیں ہوسکتی۔'' کمار بابو نے بظاہر تو راکیش اور چمپا کو ہدایت دی مگر ان کی نظریں موہن کی طرف تھیں اور موہن بھی یہ سمجھ رہا تھا کہ ان کا مخاطب وہ خود تھا۔

دفتر سے واپس آکر کمار بابو جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پنکھے کے سوئچ کو آف کردیا۔ پنکھے کی رفتار نے دم توڑنا شروع کیا تو فرش پر پڑے ان کے تینوں بچوں میں زندگی آنے لگی۔ چند لمحے بعد وہ تینوں ایک ساتھ اٹھ بیٹھے۔

کمار بابو کی قمیص کو ہاتھ میں لیتے ہوئے بیوی نے کہا:

''اتنی گرمی میں بھی نہ چلے گا تو کس کام کا۔''

''ہاں چلے گا کیوں نہیں؟ مگر اب تو دن ڈھل رہا ہے۔'' کمار بابو نے آنگن کی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے نرمی سے کہا۔

گرمی کی یہ شام بھی گزشتہ دنوں کی طرح بہت گرم تھی۔آنگن میں گرچہ سورج کا پتہ نہ تھا مگر درودیوار سے گرمی لگاتار نکل رہی تھی اور ہوا کے پاؤں میں پڑی بیڑی نے اسے چلنے کیا، حرکت کرنے سے بھی روک رکھا تھا۔

موہن، راکیش اور چمپا نے باری باری ہاتھ منہ دھوئے۔ وہ اب ماں کے قریب مکمل سوال بن کر کھڑے تھے۔ راکیش نے ماں کے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے اپنی طرف گھماتے ہوئے کہا:

''ماں۔ ماں۔ پتاجی کیوں دیر تک پنکھا نہیں چلانے دیتے۔''

''پنکھا چلنے پر بجلی خرچ ہوتی ہے اور ہمیں زیادہ بجلی خرچ نہیں کرنا چاہئے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' موہن بیچ میں ہی بول پڑا۔ ''مہیش چاچا کے یہاں تو ہر کمرے میں پنکھا چلتا ہے اور وہ لوگ تو بجلی کے چولہے پر کھانا بھی پکاتے ہیں۔'' موہن نے اپنا جملہ پورا کرتے ہوئے کمرے میں بیٹھے والد کی طرف دیکھا۔

والد بچوں کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے جو اپنے احتجاج کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

''ہاں ماں۔ وہ لوگ تو بجلی سے کپڑے بھی استری کرتے ہیں۔'' چمپا نے حیرت اور انکشاف کا ملا جلا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

ماں نے بچوں سے نظریں ہٹا کر کمرے میں بیٹھے کمار بابو کو دیکھا اور پھر بچوں کو کہنے لگی۔

''چلو، تم لوگ اپنی اپنی کتابوں میں گرد پوش لگا لو —— ماسٹر صاحب کے آنے کا وقت ہو چلا ہے۔''

بچوں نے ماں سے الگ ہو کر اپنے کمرے کا رخ کیا اور جاتے جاتے پلٹ کر ماں کو ایک نظر دیکھا جو اب اپنی جگہ سے آہستہ آہستہ ہٹ رہی تھی۔

کمار بابو کے قریب پہنچ کر ان کی بیوی سرلا بھی اپنے جذبات کو روکنے میں لحہ بہ لحہ ناکام ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کچھ لمحے کے لئے خاموش کھڑی رہی لیکن جب کمار بابو نے جگہ بناتے ہوئے اسے قریب بیٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گئی۔

کمرے میں تاریکی اپنے پر کھول رہی تھی اور بچوں نے اپنے کمرے کے بلب جلا لئے تھے۔ سرلا بھی اس کمرے میں روشنی کر دینا چاہتی تھی۔ کمار بابو نے اپنے ہاتھوں کے اخبار دوسری جانب بستر پر بکھیر دئے تھے۔

''لائٹ جلاؤ۔'' بستر پر پڑے کمار بابو نے سرلا کو کہا۔ سرلا نے اٹھ کر لائٹ جلائی۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ مگر سرلا کے ہونٹوں اور رخساروں کے قمقمے ابھی تاریک تھے۔ جسے دیکھتے ہی کمار بابو نے بھانپ لیا۔ انہوں نے کریدتے ہوئے کہا:

''اب تم بھی بچوں کی باتوں میں آنے لگیں۔''

''بچوں کی باتوں کا سوال نہیں۔ کیا صرف میرے گھر میں ہی بجلی جلتی ہے؟'' سرلا نے گھٹن بھرے لہجے میں کہا۔

''دیکھو بھائی میں دوسروں کی تو نہیں کہہ سکتا۔ ہاں دو سو روپیہ بجلی کا بل میں نے کل ہی دیا ہے۔''—— کمار بابو نے تھوڑی سنجیدگی اور تھوڑی ظرافت اختیار کرتے ہوئے بیوی کے سامنے صفائی پیش کی۔

سرلا کے پاس کمار بابو کی باتوں کا جواب نہ تھا۔ اس کے چہرے کے خطوط مسلسل بے ترتیب ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اس نے پھر ایک کوشش کی۔

''بچے بھی تو کہتے ہیں نا کہ مہیش بابو کے یہاں......''

کمار بابو نے سرلا کا جملہ مکمل بھی نہ ہونے دیا۔ بیچ میں ہی بول پڑے۔

''چھوڑو دوسروں کی بات۔ یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ تم ایک کلرک کی بیوی ہو۔ ہمیں اپنی چادر کا خیال رکھنا چاہئے۔''

سرلا کمرے سے باہر جانے لگی۔ اس نے جاتے جاتے چائے کی خالی پیالی اٹھالی اور باورچی خانے سے جب لوٹی تو اس کے ہاتھ میں چائے کی دوسری پیالی تھی۔ جس سے بھاپ نکل رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکان۔ کمار بابو نے پیالی لیتے ہوئے سرلا کی مسکان کو آہستہ سے ٹٹولا۔

''کیا بات ہے؟''

''نہیں۔ میں کہہ رہی تھی۔'' سرلا نے مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''میٹر ریڈر آیا تھا۔ وہ میٹر نوٹ کر کے لے گیا ہے۔ وہ پھر کہہ رہا تھا......''

''چھوڑو ان باتوں کو۔'' کمار بابو نے جلدی سے کہا۔ ''اور پھر یہ کوئی اچھی بات نہیں۔''

''کیا صرف میرے لئے اچھی نہیں ہے؟''

''صرف ہمارے لئے ہی کیوں۔ تم دیکھنا ——— تم دیکھنا !''

اور پھر وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔

رات کے گہرے سناٹے میں سرلا کی ہلکی ہلکی آواز کمار بابو کی بند پلکوں پر اپنا اثر ڈالنے لگی اور وہ جواب دینے کے لئے اپنے حواس درست کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سرلا اگر تھوڑی دیر اور خاموش رہتی تو پتہ نہیں کمار بابو جواب دے بھی سکتے اور وہ سوالات ان کے آگے رکھ بھی سکتی۔

سرلا کمار بابو سے پانی کے نل کے لگنے کی بات پوچھ رہی تھی ——— ان لوگوں کے یہاں پانی کی ضرورت ٹیوب ویل سے پوری کی جاتی ہے۔ ان کا گھر سڑک سے نزدیک ہے۔ بالکل ایک مکان کے بعد جہاں تک پانی کے مین پائپ پھٹ جانے سے چھوٹے چھوٹے چھینٹے بھی پہنچ جاتے ہیں۔ مگر ایک سال سے زیادہ ہو چکا، ان کی درخواست منظور نہیں ہوئی اور آج جیسا کہ کمار بابو نے سرلا سے بتایا ———

''ان کا نمبر ابھی نہیں آیا ہے۔ ابھی اور وقت لگے گا۔'' لیکن سرلا نے یاد دلاتے ہوئے بتایا۔

''کانتا نے تو ہم لوگوں کے بعد پانی کنکشن کے لئے درخواست دی تھی۔''

لیکن سارے دن کی تھکن نے نیند کے ہنڈولوں کو ایسے سبک سبک ڈھنگ سے جھلایا کہ سرلا نے نہ آج دال کی اور نہ اس کے گلنے کی بات کی اور نہ کمار بابو نے سفید قمیص کے پیلے پڑتے جانے کی شکایت۔

بچے اسکول کے لئے روانہ ہو چکے تھے اور کمار بابو دفتر کے لئے گھر سے نکلنے ہی والے تھے۔ سرلا، کمار بابو کو روانہ کرنے کے لئے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے دروازے تک آئی اور ان کو یاد دلاتے ہوئے بولی۔

''وقت نکال کر جایئے گا واٹر کنکشن والے کے پاس۔''

''ہاں۔ ہاں۔ مجھے یاد ہے۔''

کمار بابو کے جاتے جاتے اس نے کانتا کے گھر نلکا لگ جانے کی بات بھی دہرائی۔

کمار بابو دفتر کی طرف تیز قدموں سے روانہ ہوئے مگر انجانے طور پر ان کے اندر اپنے آپ سے نفرت کا جذبہ بھی تیز ہوتا جارہا تھا—— میں نے کیوں سرلا سے جھوٹ بولا۔ اگر سرلا کو اب بتاؤں گا کہ دفتر والوں نے بتایا ہے کہ ہماری درخواست گم ہوگئی ہے تو وہ کیا کہے گی؟ مجھے جھوٹ نہیں بولنا چاہئے تھا بغیر نلکے کے کتنی تکلیف ہے۔ کپڑے اس تکلیف کے بعد بھی تو صاف نہیں ہوتے۔ چمپا کے بھورے ہوتے ہوئے بال اور روز دال نہ گلنے کا مسئلہ آخر آدمی سوڈا دے دے کر کب تک دال کھائے۔ درخواست گم کیا ہوئی ہوگی؟ آفس میں، میں بھی تو کام کرتا ہوں۔

اپنے دفتر سے آدھے دن کی چھٹی لے کر دو بجے کمار بابو کارپوریشن کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ اور اب تین بج رہے تھے۔ لیکن ان کے سامنے ٹیبل خالی تھا۔ مہندر جی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ کمار بابو کے حوصلے دم توڑنے لگے—— کیا ہوگا؟ آخر دیہات میں لوگ کیسے رہتے ہیں اور اتنے دن ہم نے کس طرح کاٹے لیکن سرلا کو میں کیا کہوں گا؟ اس کو تو میں منا بھی لیتا مگر کانتا کے گھر کا نلکا لگ جانے سے اب اس کا مان جانا آسان نہیں۔

کمار بابو نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے تین بجے تھے۔ انہوں نے سوچا اب اور رکنا کیا معنی رکھتا ہے اور گھر لوٹنے کے لئے تیار ہوگئے۔

سامنے کواڑ پر لگے پردے اور اس کے اوپر لگی نام کی تختی دیکھ کر یہ ارادہ ان کے دل میں بیدار ہوا کہ کیوں نہ ہائر اتھارٹی سے ملوں۔ دوسری درخواست دے دی جائے گی۔ اپنے سرکاری کرمچاری ہونے کا حوالہ دوں گا، ہوسکتا ہے کام جلد نکل جائے۔

سامنے کی تختی پر لکھے نام پر اپنی نظر جمائے کمار بابو نے کمرے کا رخ کیا اور جب پردے کے قریب پہنچے تو ٹول پر بیٹھے چپراسی نے انہیں روکتے ہوئے سوال کیا:

''کیا کام ہے آپ کا۔''

''مجھے نلکا لگوانے کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔''

''آپ مہندر بابو سے ملئے۔ انہیں سے بات کرنا ہوگی۔''

''مہندر بابو کا تو پتہ ہی نہیں ہے۔'' میں تو کتنی دیر سے بیٹھا ہوں۔''

''آپ ادھر چائے خانہ میں جا کر دیکھئے—— ادھر ہی ملیں گے۔'' چپراسی نے سامنے بنی جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

چائے خانے میں مہندر بابو کی موجودگی نے کمار بابو کی ہمت بندھائی اور ان کی آنکھوں میں سفید قمیص کی پیلی ہوتی ہوئی صورت چمپا کے بھورے ہوتے ہوئے بال اور سرلا کے ہاتھ میں کھانے کے سوڈے کی ڈبیا نے ایک ساتھ رقص کرنا بند کردیا۔ وہ ابھی اس جھونپڑی میں جانے بھی نہ پائے تھے کہ مہندر بابو اٹھتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے ساتھ ایک آدمی اور اٹھا جس نے بڑی نرمی سے مہندر بابو کو نمسکار کیا۔ اور مہندر بابو نے بھی مسکراتے ہوئے بڑے مہذب انداز میں اس جاتے ہوئے آدمی کو آداب کہا۔

مہندر بابو کے قریب پہنچ کر کمار بابو نے انہیں نمسکار کیا اور ان کے انتظار میں دو گھنٹے سے بیٹھے رہنے کی شکایت کی مگر ان کی شکایت کا لہجہ بہت نرم تھا اور اپنی پریشانیوں کا دفتر کھولتے ہوئے مہندر بابو سے اپنی درخواست کے متعلق سوال کیا۔

کمار بابو کے سوال کا جواب دیتے ہوئے مہندر بابو بولے۔

''آپ کی درخواست تو ہوگی ہی کہیں۔ لیکن ابھی اس پر کارروائی نہیں ہوسکتی۔''

''دیکھئے میری درخواست کے بعد والوں کو آپ نے کنکشن دے دیا ہے اور پھر میں تو کئی بار آپ سے مل چکا ہوں۔ آپ......''

''دوسروں کی بات دوسری ہے۔'' مہندر بابو نے اپنی بات مکمل کرنے سے پہلے قمیص کی جیب میں ہاتھ دیتے ہوئے جانے کیا کچھ اندر کرنے کی کوشش کی اور پھر بولے۔

''آپ اپنے کام سے کام رکھئے۔''

''ٹھیک ہے۔ تو آپ میری درخواست دے دیجئے میں ہائر اتھارٹی سے ملوں گا۔''

کمار بابو کے لہجے میں ہلکی سی الجھن تھی۔

مہندر بابو نے ان کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہ دی اور صرف یہ کہتے ہوئے آگے نکل گئے کہ ''بعد میں آیئے گا۔''

وہ چلے گئے اور چائے خانے میں کمار بابو تنہا رہ گئے۔ انہوں نے سوچا اب تو گھر ہی واپس جانا ہے کیوں نہ اس سے مل کر اسے دس بیس دے دوں۔ اسی لئے یہ پریشان کر رہا ہے اور ان کے ہونٹوں سے ایک دو لفظ بے خیالی میں پھسل پڑے۔

''اور کیا —— روز۔ روز۔''

کمار بابو نے دکاندار سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے پھر سوچا کہ اگر مہندر بابو کے گھر پر کل صبح چل کر دس بیس دے دیں تو یہ پریشانی تو نہ اٹھانی پڑے گی اور انہوں نے ایسا سوچتے ہوئے چائے کی دکان والے سے مہندر بابو کے گھر کا پتہ پوچھا۔

''تم جانتے ہو مہندر بابو کہاں رہتے ہیں؟''

''آپ کو پائپ کا کنکشن لینا ہے کیا؟''

''ہاں کنکشن ہی لینا ہے۔ سوچتا ہوں گھر پر کل جا کر ان سے ملوں۔''

''ابھی کیا بولے۔'' چائے والے نے معصومیت اور اطمینان بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''وہ کہتے ہیں کہ درخواست ہی ادھر ادھر ہو گئی۔ ابھی اس میں اور وقت لگے گا۔''

کمار بابو کی بات پر دکاندار ہلکا سا مسکرایا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب کھڑا ہو گیا اور رازدارانہ انداز میں بولا۔

''صاحب بات یہ نہیں ہے۔ آپ ان کی پھیس دے دیجئے درخواست تو یہ لوگ خود ہی بنا لیتے ہیں۔''

'کیا ہے ان کی فیس۔'' کمار بابو نے چمکتی آنکھوں اور کھڑے کانوں کو ایک ساتھ اس کی طرف لگا دیا۔

''پانچ سو روپیہ لیتے ہیں پائپ کنکشن کا۔''

کمار بابو حیرت ظاہر کرتے ہوئے بولے۔''پانچ سو۔نہیں میں بڑے صاحب سے ملوں گا،ان سے شکایت کروں گا۔''

''دیکھئے صاحب اس طرح آپ کے گھر میں پانی تو نہیں جا سکتا۔سب لوگ اسی طرح کام کراتے ہیں اور بڑا صاحب بھی تو......''

''کیا بڑا صاحب۔'' کمار بابو نے ہائر اتھارٹی کے متعلق جاننے کی کوشش کی۔

''بابو۔اگر صرف مہندر بابو کا معاملہ ہوتا تو اُوا ایک دو سو میں ہی کام کر دیتے۔بہت نیک آدمی ہیں۔''

ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا نہ کمار بابو کارپوریشن کے دفتر گئے اور نہ کارپوریشن والوں نے کوئی خبر دی۔سرلا بھی خاموش رہی۔مگر کمار بابو کو چمپا کے بھورے ہوتے ہوئے بال سفید قمیص کا پیلا ہوتا ہوا رنگ اور سوڈے کی ڈبیا نے اس قدر مجبور کیا کہ آخر کار فیصلے نے اپنا رخ بدل دیا—— اور کمار بابو کے گھر میں نلکا آ گیا۔بچے بہت خوش ہوئے۔سرلا کی خوشی بھی بچوں سے کسی درجہ کم نہ تھی مگر اس کے انداز الگ تھے۔لیکن کمار بابو کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ایسا لگتا جیسے کسی نے ان کے گال پر ایک تھپڑ رسید کیا ہو—— کسی نے انہیں ایک غیر آباد قلعہ میں لا کر چھوڑ دیا ہو جس سے نکلنے کا راستہ ان کی نظر میں نہ ہو۔

بچے اسکول جا چکے۔گھڑی کی سوئیاں دس بجا چکیں لیکن کمار بابو کا پتہ نہ تھا۔سرلا سوچ رہی تھی کہ آج کیا بات ہے کہ دفتر کا وقت نکلا جا رہا ہے۔اس نے دروازے کا رخ کیا۔کمار بابو سامنے ہی کھڑے تھے اور ایک آدمی ان سے باتیں کر رہا تھا۔وہ ہاتھوں کو اٹھا کر جانے گھر کی طرف کیا اشارہ کر رہا تھا۔سرلا اس کا چہرہ تو نہ دیکھ سکی البتہ کمار بابو سے آنکھیں چار ہو گئیں۔

کمار بابو نے ہاتھ کے اشارے سے کہا:

''چلو چلو میں آ رہا ہوں۔''

وہ اندر آئے۔ کپڑے تبدیل کئے اور الماری کھولی۔ سرلا تجسس بھری نظروں سے دیکھتی رہی اور جب کمار بابو بالکل تیار ہو گئے تو اس نے سوال کیا۔

''کھانا تو کھاتے جایئے۔''

''نہیں۔ میں جلدی ہی آؤں گا۔''

''کیوں۔ آفس ہاف ڈے ہے کیا؟''

''میں بازار جا رہا ہوں۔''

بازار کا نام سنتے ہی سرلا نے پھر سوال کیا۔

''بازار کس لئے؟''

اسے کوئی جواب نہ ملا اور کمار بابو گھر سے باہر نکل گئے۔ دو گھنٹے کے بعد لوٹے۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی سرلا کو آواز دی۔ ''سرلا۔''

چند لمحوں بعد جب سرلا سامنے آئی تو اس نے دیکھا کمار بابو کے چہرے پر نئی قسم کی مسکراہٹ ہے۔ نیچے فرش پر اخبار کے ٹکڑے اور ردی کاغذ بکھرے پڑے ہیں اور ٹیبل پر چمکتا ہوا ہیٹر اور بجلی کا آئرن اس کے سوال کا جواب بنے ہوئے تھے۔

نیرنگ خیال - جون ۱۹۸۹ء

راولپنڈی

آتش بیگانہ

فون پر اس نے دہاڑا۔

''ارے ماد...... چ...... کچھ بھی تو بول۔ بولتا کیوں نہیں۔'' پھر اس نے ریسیور پٹک دیا۔ اس کی آنکھیں ابل پڑی تھیں اور سب کے کان جھنا گئے۔

''کیوں جی''—— اس کی بیوی گھبرائی ہوئی قریب آ کر بولی۔

''آخر کو گھر میں بچے ہیں۔ جوان ہوتی ہوئی بیٹی ہے۔ تم اس طرح جو......''

''چپ رہو۔ میں جانتا ہوں کہ کون ہے اس لئے تو......''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر بات کرنے کا اور ڈھنگ ہو سکتا ہے۔''

صلاح الدین بات کرنے کے دوسرے ڈھنگ پر سوچے بغیر کپڑے تبدیل کر گھر سے نکلنے لگا تو بیوی دیوار بن گئی۔

''اس طرح غصّے میں گھر سے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تو کوئی غلط بات نہیں کہی۔''

صلاح الدین نے بیوی کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور بغیر جواب دئے گھر سے باہر قدم رکھا۔ اب وہ شارع پر آگیا۔ اس نے دیکھا ہر آدمی ایک سوالوں کا بستہ اپنی پیٹھ پر لادے ادھر ادھر بھاگ رہا ہے، اور وہ خود اس بھیڑ کا حصہ ہوگیا ہے۔ تب اس نے محسوس کیا—— کافی بڑا سا اجاڑ اجاڑ گنبد، جس کی دیواروں پر رنگ وروغن برائے نام بھی نہیں، ابھی اندھیرا ابھی اجالا - اور گنبد کے نیچے فرش پر کھڑا وہ آوازوں کے گھیروں میں سکوت کی چادر اوڑھے گم سم۔ ہر سو راستے گم۔

شام تک بجھا بجھا صلاح الدین بے مدعا بھٹکتا رہا۔ چھٹی کا دن یوں ہی برباد ہونے کا خیال آیا تو گھر لوٹا۔ بچے سویرے ہی سو گئے تھے۔ بیوی کمرے میں دھیمی روشنی میں لیٹی چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ صلاح الدین کے آنے پر اٹھی اور فوراً تیز روشنی کا بٹن دبا کر سامنے آگئی۔ اور اس کے چہرے پر پڑی شکنوں میں اپنے من کی باتوں کے نشانات ڈھونڈنے لگی۔ صلاح الدین اب تک خاموش کمرے میں اِدھر اُدھر نظروں سے کچھ تلاش کرتا رہا تو اس کا کلیجہ بیٹھنے لگا۔ اسے لگا کہ بات سچ ہے۔ لیکن فوراً دل کو کڑا کیا۔ اور اس کے سامنے بستر پر بیٹھ گئی۔ دل میں ایک آواز ابھری—— ''کہہ کر تو دیکھیں—— یہ جب گھر میں نہیں ہوتے تو کیا فون اس طرح آکر مجھے تنگ نہیں کرتے —— مگر میرے پاس گواہ کہاں —— سب جھوٹ ثابت ہوگا......''

صلاح الدین خاموش خاموش کپڑے تبدیل کرتا رہا پھر اس نے کھانا لگانے کو کہا۔ کھانا کھا کر آرام کرنے جب بستر پر دراز ہوا تو بھی لب بستہ ہی رہا۔ بیوی نے اس خاموشی کے جالے کو توڑنا ضروری سمجھا۔ پیش قدمی کرتے ہوئے بولی۔

''کیوں جی ابھی تک آپ کو میری بات کی تکلیف ہے؟''

''کون سی بات؟'' صلاح الدین نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

بیوی نے ماحول کو سازگار کرنے کی کوشش کی۔

''چلئے جب آپ کو بات ہی یاد نہیں تو......''

''تم بتاؤ تو سہی! آخر کون سی بات ......'' صلاح الدین مسکرایا۔

''چھوڑیے۔ ہٹایئے۔'' بیوی سنجیدہ ہوگئی۔

پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ صلاح الدین چھت کو گھورے جا رہا تھا اور بیوی انجانی باتوں کے ابھرنے سے قبل کے خلاء میں ڈول رہی تھی تب ہی صلاح الدین نے کہا۔

''ہوسکتا ہے۔''

''کیا؟''

''ہوسکتا ہے یہ پڑوسی کے بیٹے کی شرارت ہو۔ وہی ہمیں بار بار فون کر کے تنگ کرتا ہو۔''

''کیوں؟''

''میں نے ایک دن اس کو گلی میں کوڑا پھینکتے ہوئے منع کیا تھا۔''

''اس سے کیا ہوتا ...... ہے۔ وہ تو اکثر اب بھی کسی نہ کسی ضرورت سے آتا ہے تو بڑی نرمی اور خلوص سے باتیں کرتا ہے۔''

''وہ آتا ہے؟''

''بالکل —— کل بھی فون کی ڈائرکٹری لینے آیا تھا۔ پھر واپس کرنے خود ندیم ہی آیا۔''

''اور تم نے جو اس کی کام والی کو اپنے یہاں رکھ لیا ہے!''

''کام والی خود سے آئی ہے۔ وہ چار دن کی چھٹی لے کر گئی تھی اور آج دسواں دن بھی ہے۔ وہ لوگ جانتے ہیں۔''

''کیا؟''

''اس سے پہلے بھی کئی گھروں سے کام چھوڑ چکی ہے۔ مچھنا ہی ہے نا۔''

صلاح الدین نے بھی حامی بھری —— ''ہاں۔ ہاں جھنک بتا ہی تو ہے۔''

''پھر —— اس کی کوئی بات نہیں ہے۔''

کھڑکی کے پردے اس بیچ کچھ کچھ ہلنے لگے اور کمرے میں ٹھنڈی خوشگوار ہواؤں کا گذر ہوا تو صلاح الدین نے کہا ——

''لگتا ہے بارش ہونے والی ہے۔''

''نہیں۔''

''موسم لیکن اچھا ہوگیا ہے۔''

صلاح الدین کے احساس پر بیوی نے کنکر اچھالتے ہوئے کہا ——

''ہوسکتا ہے یہ حرکت آپ کے آفس کے کسی آدمی کی ہو۔''

بیوی کے اندیشے کی چنگاری پر پانی ڈالتے ہوئے صلاح الدین نے فوراً کہا۔

''بالکل نہیں ...... ہمارے آفس میں ایسا کوئی آدمی نہیں ......''

''تو پھر آپ کا کوئی پرانا جاننے والا......''

صلاح الدین نے کچھ سنبھل کر معاملے کو سمجھنا چاہا بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''فون پر کیسی آواز ملتی ہے؟ —— میرا مطلب .... بھاری بھاری بھرپور مرد کی آواز یا پھنسی پھنسی؟''

''مرد کی؟ کون مرد؟؟ بولتا کہاں ہے کوئی۔''

''تو پھر تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟''

''کیا؟ ——''

تبھی گویا سانپ نے پھنکارا۔ فون کی گھنٹی پر صلاح الدین کے چہرے کا رنگ خوف سے آلودہ ہوگیا۔ اس نے خود سے سوال کیا —— ''اتنی رات گئے بھی۔''

اس کی بیوی تیزی سے یہ کہتی اٹھی کہ ——

''ٹھہریے میں دیکھتی ہوں۔'' —— اس نے فون اٹھانا چاہا تو صلاح الدین نے جھپٹ کر ریسیور لے لیا —— لیکن دوسری طرف کوئی نہیں تھا۔ واپس بستر پر آتے ہوئے ایک نظر فون پر ڈالی پھر صلاح الدین نے کہا۔

''چھوڑ دو۔ فون کا ریسیور اتار دو۔ کتنا ہی دیں گے۔''

بیوی کو اس کی یہ ادا پریشان کر گئی۔ اس نے سوچا، پوچھے کہ عقاب کی طرح جھپٹنے کا کیا مطلب ہے۔ مگر وہ خاموش ہوگئی۔

صلاح الدین نے جھک کر سائڈ ٹیبل سے سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی۔ ماچس کو گھسا اور ایک لمبا کش لے کر کھڑکی سے باہر دور کہیں دیکھنے لگا۔ اس کو لگا چاروں طرف سے گھر گیا ہے۔ کوئی راستہ نہیں ہے۔ یکا یک اس نے اپنے اندر کمزوری کے احساس کو بازو پھیلاتے ہوئے محسوس کیا۔ پھر گہری دھند اس کی طرف بڑھتی ہوئی۔ اور بڑھتے بڑھتے دھند نے ایک گنبد کی شکل اختیار کر لی۔ جہاں وہ چیخنا چاہتے ہوئے بھی بے سدھ ہی رہا۔ اس کی انگلی سگریٹ سے جوں ہی جلی اس نے فوراً فرش پر پھینک دیا اور بستر پر ایک جھٹکے کی جنبش پا کر بیوی کے بھاری ہوتے ہوئے پپوٹے سے کوئی چیز سرک کر نیچے گری۔ اس نے صلاح الدین کی طرف رخ کیا اور کچھ جاننے کے لئے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' صلاح الدین نے مختصر سا جواب دیا اور بستر پر پھر اٹھ بیٹھا۔ اس نے نیا سگریٹ جلایا اور ایک لمبا کش۔ پھر ایک لمبا کش—— ایک اور لمبا کش۔ دھواں ہی دھواں تب بیوی نے ہلکا سا کھانسا اور یہ محسوس کیا کہ رات اسی طرح گذر جائے گی۔ صلاح الدین پھر کھڑکی سے باہر تاریکی میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک لمحہ کے بعد اس نے پاؤں کے پاس پڑی چادر کو لمبا کیا اور پہلو میں لیٹی بیوی اور صلاح الدین کے بیچ چادر ایک خط مستقیم کی طرح کھنچ گئی۔

صلاح الدین نے چادر کو آہستہ آہستہ اوڑھتے ہوئے کہا۔

''سو جاؤ—— اب کچھ نہیں سوچنا ہے۔ کچھ بھی نہیں...... ہم سوچ سوچ کر بھی کچھ نہیں سوچ سکتے تو فائدہ۔ آنے دو۔ سنتی ہو۔ آنے دو جتنی بار آئے۔ ہمیں کیا۔ جو کوئی بات کریگا ہم اس سے بات کریں گے۔ اور جو صرف گھنٹی...... اب اس طرح کتنا چلے گا۔ کٹا دینے

میں فائدہ ہے۔''

''کٹا دینے سے کیا فائدہ۔'' بیوی کے سامنے اس کی بہن کا چہرہ چمک گیا۔ اس نے سنبھالا لیا۔ ''موبائل لے لیجئے۔''

''موبائیل یہاں تک آنے میں ابھی سال بھر کی دیر ہے۔ پھر یہ کہ —— موبائل مجھے زیادہ بھلا نہیں لگتا۔ آدمی بندھ جاتا ہے —— اچھا دیکھا جائے گا۔''

صبح صلاح الدین دیرے سے اٹھا۔ تیار ہو کر دفتر چلا گیا۔ ایک نظر میں دفتر میں لوگوں کے بیچ سب حسبِ معمول ہی لگا۔ اپنے ٹیبل پر بیٹھنے کے بعد اس کو کبھی کسی کی خبر ہی نہ رہتی۔ مگر اس نے آج تقریباً تمام لوگوں سے علیحدہ علیحدہ قریب جا کر ملاقاتیں کیں۔ باتیں کرتے ہوئے کم کم بولنے اور دوسروں کی زیادہ سننے کا ارادہ کر کے دفتر میں داخل ہوا تھا۔ دن بھر یہی انداز رہا۔ جس کسی سے ملتا اس کی باتیں اچھی طرح ذہن میں سمیٹ کر واپس اپنے ٹیبل پر آتا اور اک ذرا غور کرتا۔ اس کے دفتر میں کل نفر تو دس تھے لیکن آج سات ہی حاضر تھے۔ اس کا افسر دفتر کے کام سے باہر گیا ہوا تھا اس لئے کسی کی دلچسپی کام میں تھی نہیں گپیں ہانکنے میں وقت گذر گیا۔ اس کے اندر سوالات کے بگولے بدستور چکّر کاٹتے رہے۔ چاہ کر بھی کسی سے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ خیال آیا کہ سُدھاکر جو اس کا ہم جماعت بھی ہے، اس سے بات کرے۔ لیکن توسنِ خیال پر بیوی کے مشورے کی تصوراتی تادیب نے لگام کسا۔ ''اب لوگ کسی کی مدد نہیں کرتے —— بس مزہ لیتے ہیں۔'' صلاح الدین کو بھی لگا۔ بات پھیل گئی تو ایک نہ شد دو شد کا معاملہ نہ ہو جائے۔ ابا نے کتنی بڑی بھول کی تھی۔ بچپن کا یہ واقعہ بالکل تازہ لگتا ہے۔ آنگن میں ایک پتھر گرا۔ شاید کسی نے کتے بلّی پر دے مارا ہو یا کھیل کھیل میں کسی نے پتھر اچھالا تھا۔ گھر میں جب گرا تھا تو ابا نے فوراً شور مچایا اور پورے محلے والوں کو مغلظات کے سیلاب میں ڈبو دیا تھا۔ ابا بھی عجیب تھے۔ پہلے دن تو سمجھا کہ کسی چور کی حرکت ہے۔ جو گھروں کی کیفیت جاننا چاہتا ہے۔ کواڑ کھول باہر نکل گئے اور لگے چلّانے —— ''یہاں کیا لینے آیا ہے۔ کیا رکھا ہے۔ جا مارواڑی کے یہاں جا۔''

اس کے بعد تو روز ایک دو پتھر گرنے کا معمول ہو گیا۔ اس خشت باری پر ابا کے اضطراب کو رہٹ لگ گئی۔ وہ تو اماں تھیں جنہوں نے ابا کو سنبھالا۔ اماں جنتی تھیں۔ ان کی دعاؤں کی برکت سے گھر جنت نشان بنا رہا۔ لیکن یہ خبیث کدھر سے میری ذات کی منڈیر پر آبیٹھا ہے۔ پتا تو چلائیں گے ہی —— سارے دن کی کاوش کے بعد یہ فیصلہ ٹھہرا۔ دفتر کے کسی آدمی پر شک کرنا فضول ہے۔ شیشے کے گھر والے —— یہاں تو آہستہ سانس لینے کی روایت ہے۔ آگ کا پتا چلانے کے لئے دھویں کی تلاش ضروری ہے۔ دھواں۔ آگ۔ دھواں۔ گھر۔ اسی ادھیڑ بن میں دن کٹ گیا۔

گھر لوٹتے ہوئے صلاح الدین کو اپنے کاندھے کا بوجھ کچھ ہلکا لگا۔ گٹھریاں تو اس کے کاندھوں پر اب بھی انگنت تھیں مگر اس نے محسوس کیا —— ایک گٹھری اس کے کاندھے سے سامنے زمین پر گرتے ہی کھل گئی۔ مانوس سی خوشبو میں سب کچھ صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تعفن تو اپنی شناخت آپ ہے۔ اسے دوسری گٹھریوں کا انتظار کرنا ہے۔ کرب کا سلسلہ تو ٹوٹے گا۔ گھر سے نکلتے ہوئے جو بوجھ تھا وہ کسی قدر کم تو تھا۔

بیوی گھر پر سارے کام کاج نبٹاتے ہوئے قدرے خوش تھی۔ آج کوئی انچاہا فون نہیں آیا تھا۔ وہ شام کو صلاح الدین کے آنے کے انتظار میں بشاش تھی۔ اس کو گھر پر پڑی الجھن کی اُمس کم کم لگی۔ دن ڈھلنے سے قبل اس نے آج کھیر بنالی تھی۔ گھر بھر کی پسند۔ بس صلاح الدین کے آنے کی دیر تھی۔ بچے بار بار اپنے حصے کی مانگ رہے تھے۔ مگر کچھ دیر اور۔ کچھ دیر اور کہہ کر انہیں روکے رکھا گیا۔ صلاح الدین آیا۔ اس نے بھی ایک بڑے سے پیکٹ میں گلاب جامن اور سوہن حلوے خرید لائے۔ ہاتھ منہ دھوکر چائے پینے بیٹھا۔ بیوی نے بچوں کو آواز دی۔ بچوں نے کھیر کے ساتھ سوہن حلوا اور گلاب جامن دیکھ کر شور مچا دیا۔ بیوی کو یہ خوشیوں بھرا ماحول خوب نشاط بخش رہا تھا۔ بچوں نے سب سے پہلے گلاب جامن پر ہاتھ ڈالا اور بڑی لڑکی نے اپنے پاپا کے لئے کھیر بڑھائی۔ صلاح الدین نے ہمیشہ کی طرح کھیر کی تعریف کی ''بہت اچھی بنی ہے...... واہ'' اور خوش ہو کر کھائے جا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر

پھر ایک گلاب جامن اٹھایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی نے کڑک مرغی کی طرح کٹکٹایا۔ بڑی بیٹی کمرے میں داخل ہوئی اس نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آئی تو اس نے ریسیور اک ذرا زور سے پٹک دیا اور برآمدے پر لوٹ گئی——ڈائننگ ٹیبل پر گلاب جامن کے برتن میں اب صرف برائے نام رس بچا تھا باقی سب ختم ہو چکا تھا۔ اس نے کھیر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ صلاح الدین نے بھی فون کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔ صرف بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ جس پر ایک عجیب سا کرب امڑ آیا تھا جس کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ صلاح الدین کو لگا کوئی بار بار اس کے خوش لباس پر چھپ کر کیچڑ اچھال رہا ہے۔ پھر ماحول ایک دم بدل گیا۔

گلاب جامن صلاح الدین کو بہت پسند تھے۔ اپنی نئی نویلی بیوی کے لئے وہ لگاتار ایک ماہ تک روز گلاب جامن لے کر ہی گھر میں داخل ہوتا۔ بیوی کم کم کھاتی مگر یہ، بس چلے تو سب کھا جائے——لیکن ابھی ابھی جو گلاب جامن اٹھایا تھا اسے بے دلی سے رکھ کر جانے کیا کچھ سوچنے لگا۔ بیوی کو لگا یکایک سیاہی نے پورے گھر پر اپنی گہری چادر تان دی ہے اور بے دال کا بودم اپنی مکروہ آواز میں چیختا ہی جا رہا ہے۔ مگر اس نے اپنا سر جھٹکا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے صلاح الدین کے قریب آئی۔ اس نے پھر استفسار اور انکشاف کے ملے جلے انداز میں باتیں کرتے ہوئے صلاح الدین کی فکر پر گل افشانی اس طرح کی کہ وہ خواہ مخواہ میں پریشان نہ ہو۔ اب تو فون کے ساتھ نمبر ڈیٹکٹر لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی بہن نے آج اسے فون پر بتایا ہے کہ اس نے اپنے فون میں شناخت کی غرض سے آئی ڈی کالر لگایا——اس لئے محکمہ فون سے رابطہ کیا جانا چاہئے۔ ابھی ابھی یہ اسکیم آئی ہے۔ کم لوگوں کو خبر ہے، پھر تو بھیڑ بھی بڑھ جائے گی۔ بیوی کی باتوں پر صلاح الدین نے بڑے دھیان سے توجہ دی۔ اور کل دفتر سے چھٹی رکھ کر وہ اس کام کے لئے خود کو بہ آسانی تیار کرتے ہوئے سکون سے سرشار ہو گیا۔

دن بھر کی تگ و دو کے بعد فون میں آئی ڈی کالر لگ گیا۔ گھر اب ایک بار پھر باعث رشک اور پرسکون لگنے لگا۔ اب بھی فون آتے رہے۔ جب بھی گھنٹی بجتی سب سے پہلے صلاح الدین ڈیٹکٹر پر نمبر پڑھتا جانے پہچانے فون اٹھاتا، باتیں کرتا اور کوئی نمبر اگر جانا پہنچانا نہ ملتا تو سب سے پہلے وہ نمبر ڈائری پر لکھتا۔ اس کو آئی ڈی کالر کی میموری پر بھروسہ تھا پھر بھی فون اٹھانے سے قبل فون کرنے والے کا نمبر ڈائری پر ضرور لکھتا۔

حالانکہ اس نے چچازاد بھائی کی شادی میں جانے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا مگر اچانک گھر بھر کے ساتھ شرکت کا ارادہ کیا۔ اور سارا کام نبٹا کر شہر سے کچھ دن کے لئے باہر جاتے ہوئے اس کو اچھا لگا۔ شادی میں شرکت کر وہ پانچ دنوں کے بعد لوٹا تو کچھ پرانی یادوں کی تجدید اور کچھ نئے مراسم اور تجربے کا نکھار اس کے ہمراہ تھا۔ جس کی خوشبو سے امنگوں کو تحریک مل رہی تھی اور ایک خوشگوار ماحول اس کی چاروں جانب پھیل رہا تھا۔ گھر کی ساری چیزیں اپنی جگہ پر تھیں۔ لیکن بیوی نے گھر کا جائزہ لیا تو لگا جیسے باسی روٹی کسی نے اس کے آگے رکھ دی ہے۔ وہ کمر کس کر فرش اور صوفے گدے صاف کرنے میں جٹ گئی۔ صلاح الدین نے بیوی کو مصروف دیکھ کر سفر سے گھر تک ساتھ آنے والے چچی جان کے سندیسے اور مٹھائیوں کو زہر مار کیا اور آفس نکل گیا۔ ادھر بیوی نے چائے تک نہ دی۔ وہ اب باورچی خانے کی ایک ایک چیز کو نیا کرنے میں جٹ گئی۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ پوری گھنٹی بج کر کٹ جانے کے بعد پھر سے بجنے لگی تو اس نے کام چھوڑ کر فون اٹھایا۔ ادھر سے اس کی بہن کی آواز ملی۔ ایک دوسرے کی خیریت اور گھر کے کام کاج پر دیر تک تبصرے کرتی رہیں۔ وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ آج ہی آئی تھی، اور اسی شہر میں رہتی ہے۔

صلاح الدین جب گھر آیا تو شام ڈھل چکی تھی۔ اس نے دن بھر کے آنے والے فون کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر کھانے کی میز پر چین کی سانس لیتے ہوئے شادی کے موقعہ پر لوگوں سے ملاقات کا ذکر چھیڑا۔ اس کو چچازاد بھائی کی دلہن اچھی لگی۔ اس کی بیوی مگر اصرار

کرتی ہی جارہی تھی کہ دلہا دلہن دونوں کافی بچ رہے تھے۔ اچانک گھنٹی بجی تو صلاح الدین نے بڑھ کر فون اٹھایا۔ رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے نمبر پڑھا۔ وہاں پڑے قلم سے نمبر اپنی ہتھیلی پر لکھا۔ پھر نمبر ملایا اس کو لگ رہا تھا کہ اب، بس اب کچھ ہونے والا ہے۔ دوسری طرف سے جیسے ہی کسی نے ''ہیلو'' کہا۔ صلاح الدین بول پڑا۔

''کیا بات ہے؟''

''کون؟''

''آپ کون ہیں؟'' صلاح الدین کی آوز اب کے تلخ ہوگئی۔

دوسری جانب سے نرمی سے آراستہ آواز آئی——

''بھائی آپ نے فون کیا ہے۔ آپ بتائیں کہ......''

''اور آپ نے کیا کیا ہے؟ فون نہیں کیا...... آج تم بتاؤ کہ تم اتنے دنوں سے مجھے کیوں تنگ کرتے......''

''میں نے...... آپ ہیں کون؟''

''میں کون ہوں۔ ابھی پولس کے ساتھ تمہارے گھر پہنچ کر بتاؤں گا۔ کمینے پن کی حد ہوتی ہے۔ ہمارے آئی ڈی کالر پر تمہارا نمبر ہے۔''

صلاح الدین کی تلخی میں ہلکی سے مسکراہٹ شامل ہوگئی۔ اس کو لگا وہ ایک فاتح ہے جس نے کسی چھاپا مار کو دھر دبوچا ہے۔ صلاح الدین نے دھاڑا——

''کیا سمجھتا ہے رے''

صلاح الدین کا غصہ ابل رہا تھا۔ اس نے ذہن میں پڑے بھدّے بھدّے الفاظ کی تھیلی کو جیسے ہی ٹٹولا، مخاطب نے فون رکھ دیا۔ بیوی پاس ہی کھڑی تھی۔ کسی قدر نئے وسوسے میں پڑ گئی۔ فوراً بول پڑی ——

''کیا پولس کو خبر کرنی ہے؟ نہیں۔ نہیں۔''

''آخر یہ ہے کون؟ اور کیا چاہتا ہے؟؟

بیوی تلملا گئی —— ''کس سے پوچھ رہے ہو؟ پتا چلالو۔ پولس کو خبر کرو۔''

''نہیں۔ پولس کا تو میں نے اس کو..........''

اتنا کہہ کر صلاح الدین نے پھر فون لگایا—— اس طرف فون اٹھا۔ اِس نے جیسے ہی کچھ کہنا چاہا۔ اُس نے فون رکھ دیا۔ صلاح الدین بڑبڑایا——

''حرام زادہ —— فون پٹک رہا ہے۔''

بیوی کی بڑھتی ہوئی الجھن میں اضافہ ہوگیا۔ اس کو لگا کشتی بھنور میں پھنس گئی ہے اور ملاح پتوار سے بے نیاز بھنور کے عناصرِ تنظیم پر غور کر رہا ہے۔ اب اِس نے آگے بڑھ کر نمبر ملایا۔ ادھر سے کسی نسوانی آواز نے ''ہیلو'' کہا —— ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بیوی نے صلاح الدین کو دیکھا۔ پھر بولی ——

''تم نے جھوٹ کیوں بولا؟''

''کیا ——؟''

''آواز تو عورت کی ہے۔''

''لاؤ—— دیکھیں——'' صلاح الدین نے ریسیور کان سے لگایا تو رشتہ منقطع ہو چکا تھا۔ بیوی کے چہرے پر سفیدی چھا گئی۔ اس نے پھر کہا ——

''تم نے جھوٹ کیوں کہتے ہو کہ مرد کی آواز ہے؟''

''بالکل''

''—— نہیں تم غلط......''

''عجیب بات ہے!'' صلاح الدین نے ابھرتی ہوئی ہنسی کی لگام کس کر کھینچا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ آواز مرد ہی کی......''

''میں کیوں جھوٹ بولنے لگی......!''

صلاح الدین کو لگا، بیوی اب رو دے گی۔ اس نے اچانک موڑ کاٹا۔ ''چھوڑ و ہٹاؤ — جانے دو۔''

صلاح الدین بار بار فون کرتا رہا اور اس طرف سے وہی نسوانی آواز ملتی رہی — بیوی کی موجودگی سے لرز لرز کر وہ فوراً فون رکھ دیتا — دو تین دنوں تک یہی کچھ ہوتا رہا۔ اس کے بعد گھنٹی تو بجتی رہتی مگر اُس طرف کوئی فون نہیں اٹھاتا۔ اور صلاح الدین کے آئی ڈی کالر پر پھر وہ نمبر بھی کبھی نظر نہیں آیا۔

زخم شناسائی

''ہاں یہ مناسب ہے''—— مدن اتنا سوچتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

درختوں کے جھنڈ میں تنہائی کی چادر اوڑھے پاس پاس بنے ہوئے بینچ جس کے سامنے سے تو روشنی کا گذر ہوتا لیکن پشت تک جاتے جاتے سورج کی شعاعوں کو جیسے گہن لگ جاتا—— یہاں خاموشی کا ایک سبب شاید یہ بھی تھا۔ اسی وجہ سے اس نے کبھی اس بینچ پر کسی کو بیٹھتے نہیں دیکھا۔ آج مدن نے اسی لئے یہ جگہ تجویز کی تھی۔ بینچ کے قریب پہنچ کر تھوڑا مسکرایا۔ پھر مسکراہٹ میں خود بخود ہلکی ہلکی زہرناکی شامل ہوگئی۔

جیب سے رومال نکال کر بینچ کی گرد جھاڑتے ہوئے اس نے ایک نوعمر جوڑے کو بینچ کے پیچھے سے نکل کر درخت کی اوٹ میں گم ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ چھپنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ مدن بیٹھنے کی بجائے واپس ہوگیا۔ اس کی زبان سے واپس ہوتے ہوئے بے ضرر سا جملہ پھسل پڑا۔

''اس سے اچھا ہوتا کہ آپ لوگ——'' اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ لیکن نہ

چاہتے ہوئے بھی پھر بول پڑا—

''یہ کوئی...... جگہ ہے۔''

مدن اور کچھ کہتا مگر لفظوں کے پنکھ اُدھڑ رہے تھے۔ جب ان دونوں نے مدن کا چہرہ ٹھیک سے دیکھا تو یک بارگی بول پڑے—

''چلو۔چلیں............اس نے تو سارا............''

مدن نے ان کی آواز پر رخ پھیرا تو دیکھا کہ درختوں سے ابلنے والی گہری تاریکی ان کو اپنے دامن میں چھپاتی جارہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو اس طرح سنبھالے ہوئے تھے۔ جیسے نشے میں نڈھال کو، اس کا رندِ مشرب، اس کے گھر چھوڑنے جاتا ہو۔

مدن گھر پہنچ کر بھی کھویا کھویا سارہا۔ رات کا کھانا کھا کر بستر پر دراز ہوا کچھ دیر بعد اس نے بیوی سے کہا۔ ''مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔'' بیوی کے اصرار کے بعد بھی وہ کمرے سے نکلا اور بیٹھک خانے کی طرف چلا گیا۔ پیچھے پیچھے بیوی آئی۔ دیکھا، وہ کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح دیوان پر پڑا ہوا تھا۔ بیوی نے کمرے کا بلب بجھایا اور کچھ زیرِ لب بڑبڑاتی ہوئی لوٹ گئی۔ مدن کی آنکھوں میں نیند اب بھی نہ اتر سکی۔

کچھ دیر مدن اسی طرح پڑا رہا۔ پھر اس کے منہ سے چند الفاظ بے ارادہ نکل پڑے— ''گپتا۔ایڈیٹ''— وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سامنے دیوار پر نظریں جمائیں...... جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو...... کسی سراغ کی کڑیوں سے کڑیاں ملا رہا ہو۔ بیوی اس بیچ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ تکیہ، پانی کا جگ اور گلاس رکھ کر واپس چلی گئی۔ اس نے جاتے جاتے کہا۔ ''سو جاؤ۔'' مدن نے سوچا اس کو روکے، مگر وہ نکل گئی۔ اور اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے زور سے کواڑ لگا لیا۔

رات کی تنہائی اور سونا پن بڑھتا رہا۔ وہ کھلی آنکھوں سے اندھیری چھت کو تکے جارہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ چوراہے پر راہ کا تعین کرتے ہوئے ٹھہر گیا ہے اور ہر طرف ٹریفک کا ہارن بے ترتیبی سے گونج رہا ہے۔ بار بار آنکھیں بند کرتا نیند کا انتظار کرتا پھر آنکھیں

کھل جاتیں ـــــ اس نے اٹھ کر بلب جلایا۔ گھڑی دیکھی ۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ اسے جلدی سو جانے کی فکر ہوئی ۔ اس نے پانی پینے کے لئے گلاس اٹھایا پھر اس کو رکھ دیا اور جگ اٹھا کر منہ سے لگا لیا، بلب بجھایا اور سونے کے لئے دیوان میں دھنس گیا۔ کروٹ پر کروٹیں لیتے ہوئے خیال کی کمندیں پھینکنے لگا ـــــ کیا زیادہ سگریٹ پی جانے سے نیند نہیں آ رہی ہے ـــــ نہیں۔ خواہ مخواہ دوسروں کے ...... اس نے آنکھیں بند کئے کئے دماغ کو ڈھیلا چھوڑ دینے کا فیصلہ لیا۔ بوجھل ذہن پر نیند کی ایک لہر چٹکی سی لیتی اور غائب ہو جاتی ۔ دفعتاً ایک گونج سی ابھری۔ صدائے بازگشت جیسی ۔ ''چلو ہوتا ہے ـــــ ان دونوں کو اگر میری بات پسند نہیں آئی تو ٹھیک ہے مگر پلٹ کر مجھے انہوں نے جو کہا ـــــ اچھا نہیں کیا ...... یہ اچھا نہیں ہوا ...... مجھے انہیں ٹوکنا ہی نہیں چاہئے ...... ۔ اور گپتا جی نے بھی تو اشاروں میں چھوٹی سی بات پر آج بہت کچھ کہا۔ دفتر میں ہر طرح کے لوگ ہیں ۔ اسے لوگوں کا خیال رکھنا چاہئے ......'' پھر نہ جانے کب اسے نیند آ گئی ۔ لیکن جب بیدار ہوا تو سورج سر پر سوار ہو چکا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے اٹھا۔ جلدی تیار ہو کر دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلنے لگا تو دروازے پر سریتا کھڑی تھی ۔ اس کے قریب اک ذرا ٹھٹکا۔ پرس نکالا ۔ اک نظر سریتا کو دیکھا اور پھر پچاس کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''دودھ والے کو دے دینا اور دیکھو بچوں سے کہنا کہ وہ کتابیں دیکھیں ان کو خود سے اپنا کام کرنا چاہئے ...... میں تھوڑی بہت رہنمائی کر سکتا ہوں ...... پروگرام میں بولنا انہیں ہے کہ مجھے۔''

مدن اتنا کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ سریتا خاموش کھڑی رہی اس نے پچاس کے کرنسی نوٹ کو ایک نظر دیکھا پھر مدن کو جاتے ہوئے ۔ اس کا اس طرح جانا اس کو اچھا نہیں لگا۔ وہ دفتر جاتے ہوئے روزانہ سریتا سے رتی بھر پیار کر لیتا اور سارا دن اسے من دو من میں تبدیل کرتا رہتا۔ لیکن ادھر اس کے انداز میں سرد مہری بڑھتی جا رہی تھی۔

مدن دفتر جا رہا تھا۔ گلی میں اس کے گھر سے پچیس تیس قدم پر دو بچے بری طرح

آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ دونوں کے دہانوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ سر کے بال بری طرح الجھ گئے تھے۔ غصے کی شدت میں دونوں کے چہروں پر سرخی اُمڑ آئی تھی۔ جس پر ایک دو جگہ نیلے دھبے چمک رہے تھے۔ اس نے پہلے دونوں کو ڈانٹا پھٹکارا۔ وہ پھر بھی الجھے رہے تو اس نے دونوں کے بازو پکڑ کر دو طرف جھٹکے دیے۔ تادیب کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے آنکھوں میں وحشت بھر لی۔ لیکن اسے کیا پتہ تھا —— اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو پیچھے سے کسی نے پکڑ لیا۔

''دیکھئے صاحب۔'' ہاتھ پکڑنے والے نے کہا۔ ''آپ حد سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس دن بھی آپ نے میرے بیٹے کو ڈانٹا دھمکایا تھا، اور آج مارنے بیٹھے ہیں۔ شرم نہیں آتی...... بچے پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔''

''نہیں بھائی۔'' مدن نے پلٹ کر کہا —— اور دیکھا تو تھوڑا خوف کھا گیا۔ جس نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا وہ اس سے تندرست اور قوی تو تھا ہی اس کا غصے سے بھرا چہرہ مکروہ لگا۔ اس کے گھنگھرالے بال میں تیل کی کثرت اور بھی اس کی ہیبت ناکی میں اضافہ کر رہی تھی۔ مدن نے پھر سے سنجیدگی بھرے لہجے میں کہا ——

''نہیں بھائی ......'' اور کچھ بولتا —— مگر اِس کی بات کاٹتے ہوئے اُس نے کہا۔

''نہیں کیا۔ آپ مار رہے تھے۔''

''ہاں۔ ہاں۔ آپ مار تو رہے تھے۔'' کسی نسوانی آواز نے اسے مڑ کر دیکھنے پر آمادہ کیا۔ مدن نے محسوس کیا کہ وہ بری طرح پھنس گیا ہے۔ گلی کے دو چار لوگ اور جمع ہو گئے۔ وہ ہر کسی کے چہرے کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ اس کے اپنے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے سوچا وہ نظر انداز کر سکتا تھا۔ ان لڑکوں کی طرف سے گذرتے ہوئے وہ اپنا چہرہ پھیر بھی سکتا تھا۔ جیسے ریل کے ڈبے میں بھکاری کے ہاتھ پھیلانے پر اکثر لوگ نظریں پھیر لیتے ہیں۔ ایسے میں اسے لوگوں سے نفرت ہو جاتی تھی۔ مگر آج اسے لگ رہا تھا کہ وہ ایسا ہی کرتا۔ خاصی معذرت طلبی کے باوجود بھی اسے کافی صلواتیں سننے کو ملیں۔ آخری جملہ تو

نیش عقرب سے کم نہ تھا—— ''میرا بچہ کچھ بھی کرے۔ آپ کون ہوتے ہیں؟''

سڑک تک آتے آتے وہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے آپ میں کوئی قیدی ہے، جو سزا کاٹ کرابھی ابھی جیل سے نکلا ہے۔ ایک نظر اس نے مڑ کر گلی پر ڈالی۔ دفتر جانے کے لئے تیز چلنا چاہتا تھا لیکن پاؤں کو زمین پکڑ رہی تھی۔ گویا سڑک نہ ہو ساحل دریا پر چل رہا ہو۔ جہاں مٹی ملی ریت میلوں میل بھر بھری ہی بھر بھری ہو۔

سامنے سڑک کی مرمت کا کام چل رہا تھا۔ جہاں تہاں مزدور ٹوٹے ہوئے حصے میں کولتار میں لپٹی ہوئی چھرّیاں بھر رہے تھے۔ اس نے سوچا کیا فائدہ —— ٹوٹا رہنا تو اس کا مقدر ہے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ پیشانی اور ہونٹوں پر تھوڑی سی کشیدگی در آئی۔ یہ وقت اسے دفتر میں پہنچ کر پرانے ہو جانے کا تھا۔ یوں تو اس کو کسی طرح کا جسمانی گزند نہ پہنچا تھا۔ ذہن لیکن منتشر ہو گیا تھا پھر خود کو تسلی دیتے ہوئے خیال آیا—— کیا ہوا۔ کوئی بات نہیں——

ایک عجب ادھیڑ بن میں تھا کہ آگے ٹیلیگراف آفس آ گیا۔ اس نے اچانک آفس جانے کا فیصلہ بدل دیا۔ وہ آج کی غیر حاضری کی اطلاع فون پر دینے کے لئے تار گھر کی طرف مڑ گیا۔ آج اسے سرکار کی نئی پالیسی کا مسودہ متعلقہ شعبوں میں بھیجنا تھا۔

تار گھر کے آگے پان کی دکان سے اس نے ایک سگریٹ خریدی اور پانچ کا نوٹ دیتے ہوئے ساتھ میں ایک کا سکہ مانگا۔ سگریٹ اس نے جیب میں ڈالی اور ہاتھ میں سکہ لئے دیوار گیر فون کی طرف بڑھا۔ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے لیکن اسے کان پر ریسیور کا دباؤ کچھ اس طرح لگنے لگا جیسے کان کسی پتلی دھار والی کٹوری سے کٹ رہا ہے۔

دفتر کا فون بابو سامنے بیٹھا تھا۔ ایک نظر اُس پر ڈالی۔ وہ کچھ جوڑ گھٹاؤ کر رہا تھا۔ اِس نے کان سے ریسیور ہٹایا پھر اس کا جائزہ لیا۔ دیکھا۔ سننے اور بولنے سے وابستہ کوئی پرزہ ہی نہیں ہے یہ تو خالی خولی تھا۔ مدن کے اندر اس صورت حال نے سخت جھنجھلاہٹ پیدا کی۔ اس کا جی جل گیا۔ اس کو اپنی بے پروائی پر بھی سبکی کا احساس ہوا۔ جلدی سے ریسیور کو اسٹینڈ پر رکھا اور بابو کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ کام نہیں کرتا؟ مجھے ایک لوکل فون ......''

''بات ہو جائے گی۔'' بابو نے بڑے وثوق سے کہا۔ جیسے انتظار ہی کر رہا ہو۔

قریب جا کر مدن نے کچھ جاننا چاہا۔ ''اسے کیوں کھول دیا گیا۔''

''کھولے گا کون!! آپ کی طرح کوئی بجن پرش لے گیا کھول کر۔''

''عجیب بات ہے —— ٹھیک تو کیا جا سکتا ہے —— آفس سے بھی کھول کر لے گیا —— آپ تو بیٹھے ہیں؟''

''کھولنے والا کہیں سے بھی کھول سکتا ہے۔'' بابو کے لہجے میں کچھ ترشی اُتر گئی۔ پھر اس نے مدن کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ''دو روپیہ دیجئے۔''

مدن نے انگلیوں میں پھنسے ایک روپے کے سکّے میں جیب سے ایک اور سکّہ ملا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے نمبر ملا کر ریسیور مدن کو دیا۔ بات کرنے کے بعد مدن ایک منٹ تک رکا رہا۔ اس کو رسید ملنے کی امید تھی۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے سگریٹ نکالا۔ دوسرے جیب سے ماچس کی ڈبیہ نکالی۔ سگریٹ کو ہونٹوں سے لگایا پھر اس نے کچھ سوچ کر سگریٹ جیب میں رکھ لی اور ماچس کی تیلی کو دانتوں سے نوک دار بنانے لگا۔ جب ہی تار گھر کے بابو کی نگاہ اٹھی۔ اس کی آنکھیں چمکتی ہوئی کشادہ کمپیوٹر کے اسکرین کی مانند۔ جس کو مدن نے فوراً پڑھ لیا۔ اس نے پھر رسید نہیں مانگی۔ دانتوں سے ماچس کی تیلی وہیں فرش پر تُھو کرتے ہوئے پھینک کر باہر نکل جانے میں تیزی دکھائی۔ اور پھر گھر کی طرف لوٹ گیا۔

مدن تیز تیز قدموں سے گھر میں آتے ہی بغیر کسی تمہید کے الماری سے تین چار کتابیں نکالنے لگا۔

''پاپا آپ آ گئے!'' اس کی بیٹی نے اسے دیکھ کر کہا۔

''ہاں —— میں آ گیا۔ آج چھٹی لے لی ہے۔ سوچا تم لوگوں کا پرابلم سُولو کر دوں۔''

''جی پاپا۔ پریکٹس بھی تو کرنی ہے۔''

''راکیش اور اجئے گھر پر نہیں ہیں۔ کہاں گئے؟''

''پتہ نہیں؟ کچھ دیر پہلے تک تو تھے''—— سریتا نے جواب دیا۔

''اسکول سے چھٹی کی ہے کہ سمپوزیم کی تیاری کرنی ہے۔ واہ —— مجھے کل بھی چھٹی ہے۔''

سریتا نے استفسار کیا——''کیوں؟''

''کل چھٹی کا دن ہے۔ رات اگر بجلی ٹھیک رہی تو ٹھیک ہے ورنہ کل شام تک ان لوگوں کو لکھاؤں گا۔ پھر ان لوگوں کا کام رہ جائے گا۔ یہ لوگ کتنا کچھ اپنے اندر جذب کر سکتے ہیں۔''تمہارا ٹوپک کیا ہے؟''

''گاندھی جی—— سادہ جیون اوچیہ وچار۔'' بیٹی نے چہک کر کہا—— وہ پھر بولی——''پاپا—— راکیش بھیا اور اجئے کا؟''

''ہاں۔ ہاں مجھے یاد ہے۔ راکیش کو—— بھیم راؤ امبید کر کی سماجک چیتنا، اور اجئے کا—— آتم وشواس''

اتنا کہہ کر مدن الماری سے دو تین کتابیں اور نکال کر الٹ پلٹ کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

مدن کو آج دو دنوں کے بعد دفتر جانا تھا۔ وہ سویرے اٹھا۔ گھر کے سبھی لوگ سوئے ہوئے تھے اس نے سوچا ذرا چہل قدمی کر لی جائے۔ تازہ ہوائیں کھانے نکل گیا۔ ایک گھنٹے بعد گھر میں گنگناتے ہوئے داخل ہوا۔ دفتر جانے کی تیاری میں شیو کرنے بیٹھا۔ آئینہ ہاتھ میں لے کر اپنا جائزہ لینے لگا۔ اس کو عجیب سا لگا۔ جہاں تہاں اس کے چہرے پر چیونٹیوں نے ایک ساتھ بہت سے انڈے دے دئے تھے۔ وہ سوچنے لگا تین دن کے شیو کا یہ حال ہے۔ اگر کسی وجہ سے دس بارہ دنوں تک وہ شیو نہ بنا سکے گا تو لوگ گھر سے باہر نہ جانے کس نام سے مخاطب کریں۔ تب داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زیر لب مسکرایا۔

آفس جانے کے لئے وقت سے اک ذرا قبل نکل پڑا۔ شاہراہ پر اکثر وہ مخصوص

دکان سے سگریٹ لے لیا کرتا تھا۔ دکان پر پہنچتے ہی دکاندار کو مخاطب کیا۔

''بنواری کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں بھیا۔''

''سب کشل منگل ہے نا۔''

بنواری نے اپنے چمکتے ہوئے دانت نکوسے ——''آپ ہی کے درشن نہیں ہو رہے تھے۔''

''ہوں گے۔ہوں گے۔''مدن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

بنواری سگریٹ کا پیکٹ بڑھاتے ہوئے قدرے مسکرایا۔ پھر بولا۔

''سر—— وہ —— رام چرنا کا تھوڑا دھیان رکھئے گا۔''

''کون رام چرنا؟''

''سرکار۔اُو۔میرا بیٹا۔''

''اچھا۔اچھا۔رام چرنا۔رام چرن کہو بھئی۔تم ہی رام چرنا کہو گے تو دوسرے اسے رام چرنوا کہنے لگینگے۔''اتنا کہتے کہتے اس کی مسکراہٹ ہلکی سی بے ساختہ ہنسی پر ختم ہوگئی۔

بنواری کھِسیا گیا۔ پھر نرمی سے بولا——''ہاں سرکار۔اسی کی چنتا ہے نا اب۔''

''ہو جائے گا۔ہم نے باس سے کہہ رکھا ہے۔ایک آدمی وہ میرا ضرور رکھے گا نہیں کچھ تو واٹر بوائے ہی سہی۔ پھر ہم لوگ ہیں نا۔''مدن نے جیسے کھلی ہوا میں اپنے وجود کا جھنڈا لہرایا۔

''جی سرکار۔''

دفتر کی طرف جاتے ہوئے رام چرنا کی نوکری کے علاوہ بھی کئی کام کی تختیاں یکے بعد دیگرے اس کو سلام کرتے ہوئے گذرتی رہیں۔ خیالوں کا ایک سلسلہ۔اس کو امریتا کے لئے اچھا سا لڑکا بھی تلاش کرنا ہے —— امریتا اس کے دفتر میں کام کرنے والی نیک سیرت لڑکی۔اس کے ماں باپ بڑے پرانے خیال کے ہیں —— اتنی عمر ہوگئی —— امریتا کو بھی تو کم

از کم اس کا خیال رکھنا چاہئے—— زندگی میں کیا ہے۔ ہر لمحہ مصالحت—— بس—— اگر کوئی اس کے معیار پر پورا نہیں اترتا ہے تو کیا؟...... امریتا کے لئے اس کی پسند اس کا معیار ہے۔ آدمی خواہ کوئی ہو۔ اس کو پہچان سکے۔ اس سے پیار کر سکے۔ امریتا کے سوچ میں ہی اس کے جیجا جی کا خیال ٹپک گیا۔ ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں اور کوتاہ گردن۔ وہ اکثر کہتے ہیں—— امریتا کے لائق کوئی نظر نہیں آتا۔ مدن نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں سے کوئی نہ کوئی اچھا لڑکا تلاش کر کے ہی چھوڑے گا—— امریتا ایک بار پھر اس کے سامنے آ گئی—— امریتا اس کو اچھی لگتی تھی۔

اُس کے جیجا جی کا حوالہ دے کر اس نے جب معیار کی بات کی تھی تو امریتا نے کہا تھا۔

''میں تو ایک کھلی کتاب ہوں''—— تب مدن کی آنکھوں میں بہت سی پرانی اوراقِ پریشاں کتابیں ناچنے لگیں تھیں۔ جو اَب پڑھی نہیں جا سکتیں، بلکہ وقت اور عہد کی پہچان بن کر بوسیدگی کے کباڑ پر اپنی شناخت سے محروم ہیں۔

دفتر میں آج اسے بہت سے کام نپٹانے تھے۔ وہ باری باری سے ہر کام کو ختم کرنے کے لئے میز پر جھکا ہوا تھا۔ ایک کے بعد دوسری فائل کھولتا۔ کچھ لکھتا۔ کسی کی گرد جھاڑتا اس میں سِلِپ لگاتا کسی کو دائیں طرف رکھتا کسی کو بائیں طرف، کسی کسی کو میز کے نیچے۔ اس کے سامنے ایک پرانی فائل کھلی تھی۔ انگلیوں کے بیچ لال بال پوائنٹ پھنسا ہوا تھا۔ ناک پر لگا ہوا چشمہ قدرے نیچے کھسکا ہوا تھا۔

''نمسکار''—— اتنا کہہ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے ایک ہم عمر آدمی آ کھڑا ہوا۔ مدن نے آنکھیں اٹھائیں تو اس نے مسکرا دیا۔

''اچھا۔ کیسے ہو مرلی بھائی۔'' مدن نے اس کی مسکراہٹ کا جواب دیا۔

''سب ٹھیک ہے۔ گھنشیام جی نے آج بلایا ہے۔ سوچا آپ سے پہلے مل لوں۔ آپ نے کہا بھی تھا۔''

''ہاں۔ ہاں—— گھنشیام جی۔ ٹھیک ہے۔'' اتنا کہہ کر مدن اٹھا۔ مرلی کے ساتھ گھنشیام کی میز کے قریب پہنچا۔ اسے مخاطب کیا۔

''کہئے بھئی۔ گھنشیام جی۔ دیکھئے یہ آ گئے ہیں۔ آپ نے بلایا ہے شاید۔''

''ہاں۔ ہاں۔'' گھنشیام نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔ اور میز پر پھر جھک گیا۔ مدن نے فقرہ جڑا۔

''ان کا کام آج کر دیجئے بھئی۔''

''ہوں۔''

''بہت پریشان ہو گئے ہیں۔ دوڑتے۔ دوڑتے۔'' اور مرلی کی طرف نگاہ پھیری۔ گھنشیام نے بدستور اپنی میز پر جھکے رہ کر جواب دیا——

''تو کیا ہوا۔ ہم کیا ان کو شوق سے دوڑا رہے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اب کام ہو جانا چاہئے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا۔'' گھنشیام نے سر اٹھا کر تیزی سے کہا۔ پھر لہجے میں تھوڑا سا دھیما پن لاتے ہوئے بولا—— ''عجیب بات ہے۔'' پھر ہلکے سے مدن کا جملہ دہرایا—— ہو جانا چاہئے—— اور منہ کچھ ایسا بنایا جیسے کریلے کی سبزی—— کھا رہا ہے۔

مدن نے پتوار کی ڈور کھولنے کا انداز اختیار کیا۔ بولا——

''گپتا صاحب نے تو سب کر کرا دیا ہے۔ بس اب آپ ہی کو لکھنا ہے۔ اس کے بعد صاحب سے میں کرا لوں گا!!'' —— جلدی جلدی مدن نے ساری باتیں کہہ دی تھیں۔ شاید آفس میں اپنی ساکھ بچانا مقصود بھی تھا۔

''کرا لوں گا......؟ جایئے۔ کرا لیجئے۔ گپتا صاحب۔ گپتا صاحب...... گپتا صاحب۔ آپ سب کو گپتا صاحب ہی سمجھتے ہیں کیا!! دیکھئے۔'' اس نے انگلی آسمان کی طرف بلکہ مدن کی طرف اٹھا کر مزید کہا—— ''میں نے آپ کو اس سے پہلے بھی کہا ہے۔''

''کیا۔ کیا کہا ہے؟'' مدن نے کچھ جاننے کی کوشش کی۔ اس کے لہجے میں

جھنجھلاہٹ آرہی تھی۔اور مدن سوال بنا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''یہی۔کہ آپ'' گھنشیام ہر لفظ پر آہنگ کا دباؤ بڑھا کر بول رہا تھا۔''یہی کہ آپ دوسروں کے معاملے میں مت بولا کیجئے۔ہم نے ان کو بلایا تھا۔یہ آئے ہیں کام ہوگا۔'' گھنشیام کے لہجے کی ترشی اس کی بلند آواز کے ساتھ پورے آفس میں پھیل گئی۔اس نے ایسا چاہا بھی۔پھر ایک ایک دو دو کر، اس کے ٹیبل کے قریب چار چھ آدمی جمع ہوگئے۔لوگوں کی موجودگی پر اپنا رنگ چڑھانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک بار پھر بولنے لگا——

''ہر آدمی کو اپنا اپنا کام دیکھنا چاہئے''—— پھر وہ کھڑا ہوگیا۔

مدن نے لوگوں کے بیچ کھڑے رہتے ہوئے کچھ بدلا بدلا سا محسوس کیا۔پھر خود کو سمیٹنے کی جستجو کی۔

''ہم نے صرف درخواست کی ہے۔یہ تھوڑے کہہ رہے ہیں ......ابھی فوراً کر دیجئے ......یا آپ کو کرنا ہی ہوگا۔''

''نہیں۔نہیں''—— گھنشیام نے موقع غنیمت جانا۔آواز اس نے اَب اور اُونچی کی۔پھر بولا——''آپ کیا سوچتے ہیں—— کیا آپ کہیں گے جب ہم لوگ کام کریں گے—— یوں تو کبھی نہیں کریں—— آپ دوسروں کو مشورہ دینا چھوڑ دیجئے۔پھر گھنشیام باتھ روم کی طرف چلا گیا۔جاتے جاتے اتنا اور کہہ گیا——

''ہر معاملے میں ٹانگ اڑاتے ہیں......دنیا کے......''

مدن نے محسوس کیا گھنشیام نے اپنے ساتھ اوروں کو بھی شامل کرلیا ہے۔اس کو لگا اس نے آج پھر اپنی غلطی دہرادی ہے۔اور سب ایک ساتھ دھتکار رہے ہیں۔مرلی اب مدن سے کچھ دور کھڑا ہو گیا تھا۔مدن نے اس پر نگاہ ڈالی۔سبھوں کا سوالات بھرے انداز میں جائزہ لیا اور خاموشی اپنے وجود کو منجمد کئے پسر گئی تھی—— اچانک اس بیچ گھنٹی کی آواز ابھری۔پھر متر اصاحب نے جیسے پھاوڑا ہی چلادیا۔

''بے کار میں آپ دوسروں کے معاملے میں پڑتے ہیں۔''

مدن کے لئے مزید کچھ برداشت کرنا مشکل ہوتا جارہا تھا۔ اس نے متراصاحب کو جو اپنی جگہ سے اب کھسک رہے تھے—— روکتے ہوئے کہا۔

''آدمی اکیلا تو نہیں ہوتا—— اس کے دوست اور جاننے والے بھی تو ہیں—— اور ہم تو کوئی——''

بات ابھی ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ چپراسی نے اسے خبر دی—— ''بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔''

مدن بڑے صاحب کے چیمبر کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے متراصاحب پھر کچھ بولے۔ ان کی باتوں پر وہاں کھڑے لوگوں نے ہاں—— جی ہاں—— ٹھیک بات ہے—— کہہ رہے تھے۔ مدن کو لگا۔ جیسے اس پر سب کیچڑ اچھال رہے ہیں بڑے صاحب کے چیمبر کے قریب پہنچ کر اس نے خود کو سنبھالا—— اور فوراً فیصلہ لیا۔ صاحب نے پوچھا تو ٹھیک، نہیں تو بات نکال کر سب پول کھول دوں گا۔ آخر گھنشیام سمجھتا کیا ہے——

بڑے صاحب کے چیمبر سے نکل کر جب وہ آیا تو مرلی جا چکا تھا۔ آفس کے لوگ اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ اس نے اپنی میز پر پہنچ کر فائلوں کو سمیٹا اور وقت سے پہلے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر میں وہ گھر کی جانب سڑک پر تھا۔ سڑک کے شور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھی۔ اس نے نظر گھما کر دیکھا۔ ایک بھی کتا کہیں نہیں تھا۔ تب اس نے اپنا نام صاف سنا۔ مدن جی۔ اس نے مسکرا دیا—— اس کا نام لے کر کوئی اس کو مخاطب کر رہا تھا—— اور تیز تیز قدموں کی آہٹ اس کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔

''مدن بابو—— مدن بابو—— سر۔'' پکارنے والا اب مدن کے برابر میں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا—— آنکھیں چار ہوئیں تو وہ ٹھٹک گیا۔ ''سر'' مدن کے پیچھے آنے والا اپنی سانسوں کو ہموار کرنے کے لئے اٹک رہا تھا۔ ''مدن بابو—— ہم نے ایس ڈی او سے لکھوالیا ہے۔'' وہ جلدی جلدی ساری جانکاری دینا چاہتا تھا—— ''سر''

''کیا لکھوا لیا ہے؟'' مدن نے جھنجھلا کر کہا—— پھر چلتے چلتے ہی بولا—— ''مدن بابو—— مدن بابو—— کون مدن بابو؟''

''مدن نے اتنا کہتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کے سینے سے اب دَھک دَھک کی صدا نہیں ابھر رہی ہے جو کبھی تیز اور سست ہو جایا کرتی تھی۔ آواز کا یہ سُر اَب تو بس ٹِک ٹِک کئے جا رہا ہے اور اس کے آگے صبح سے شام تک کے لمحوں کا ایک مرتب، سمٹا ہوا گراف کھنچ گیا ہے۔ جس پر وہ آگے بڑھ رہا ہے۔ جہاں ٹھہرنے اور پلٹنے کے سارے پڑاؤ پسر کر معدوم ہو رہے ہیں—— اور وہ گراف کے خانوں میں پاؤں رکھتا آگے بڑھتا چلا گیا—— بہت آگے۔

دو تہائی

چہرے کا رنگ اڑا اڑا اور اس پر دو چمکتی آنکھیں اور سارا وجود پیڑ سے کٹی شاخ جیسا—— صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ ابھی ابھی یہاں آ کر بیٹھا ہے اور اس کا کہیں کچھ گم ہو گیا ہے۔

''سنیل تم یہاں بیٹھے ہو۔'' خفگی ظاہر کرتے ہوئے اس کے دوست گوپال نے اسے ٹوکا۔ اس نے مزید کہا۔

''عجیب آدمی ہو؟ یا تو وقت نہ دیا ہوتا یا آ جاتے......''

''میں لوٹ گیا ہوں۔''

''کیوں؟......''

''پہلے بیٹھو—— پھر سنو۔''

گوپال بھی سنیل کے پہلو میں گردھاری کے آٹا چکی کے باہر برساتی میں بیٹھ گیا۔ آٹا چکی بند تھی۔ گردھاری کہیں گیا ہوا تھا۔ کام تو اس کو بہت تھے۔ پوری بستی میں اکیلا——

لیکن —— ادھر وہ جنریٹر کی تلاش میں اکثر نکل جاتا تھا۔ کہیں بھی سکنڈ ہینڈ مل جائے۔

سنیل نے کہا۔

''سنو۔ عجیب وغریب بات ہوگئی۔ گھر سے نکل کر سڑک پر پہنچا تو اچانک میرے برابر سے ایک آدمی لنگڑاتا ہوا گذر رہا تھا۔''

''تو کیا ہوا؟''

''بھائی اتنا ہی نہیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ بے چارہ پاؤں کھینچ کر چل رہا ہے۔ میں آگے بڑھ گیا۔ نظر کے سامنے ایک اور —— اپنا پاؤں کھینچتا ہوا ملا۔ میں نے آنکھیں چرالیں۔ دوسری جانب سے ایک عورت کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھی ...... اور پھر —— جسے دیکھو۔ یہی لگتا کہ چل نہیں رہا ہے بلکہ اپنے آپ کو کھینچ رہا ہے۔''

''یہ تمہارا وہم ہے۔ ایک ساتھ اتنے لنگڑے کہاں سے آجائیں گے؟''

''یقین مانو۔ مجھ سے قسم لے لو۔ سارے لوگ ...... میں اپنے آپ کو ان کے بیچ ......''

''سنیل یہ تمہاری بکواس ہے۔ الٹی سیدھی سوچتے رہتے ہو۔''

''گوپال تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟''

''لوگوں کو کیا ہوگا؟ لوگ لنگڑے لولے نہیں ہوتے کیا؟''

''ارے بھائی سب کے سب؟''

''سب کیوں ہونے لگے۔ سبھوں میں تو تم بھی ہو۔ میں بھی —— اچھا چھوڑو۔ دیکھو وہ چلا جائے گا۔ ہمیں آج اس سے مل لینا چاہئے۔ ہوٹل میں ہماری راہ دیکھ رہا ہوگا۔ اس کو آج ہی راجدھانی نکل جانا ہے —— اس لئے اب چلو......''

''ہاں وہ نکل گیا تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ اپنا یہ ارادہ بھی ادھورا......''

''ادھورا ہی نہیں ...... میں نے ٹھیکیدار کو کل شام اس کے ساتھ ہوٹل میں گفتگو کرتے سنا ہے۔ کام شروع ہوگیا تو۔''

''گوپال۔ ایسا نہ کہو۔ یہ صرف ہمارا تمہارا معاملہ نہیں۔''

معاملہ پوری بستی کا تھا۔ یوں تو یہ ایک معمولی سی بستی تھی مگر جب سے یہاں تھرمل پاور بنا اس بستی کی تقدیر بھی کھل گئی۔ شروع کے دنوں میں سبھوں کو کام ملا۔ کچھ ایک نے چھوٹی موٹی ٹھیکیداری سے پیسے بھی بنائے۔ دیکھتے دیکھتے بجلی کی فراوانی سے یہاں کی زندگی میں بڑی تبدیلی آگئی۔ نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ سب کچھ تو ہے مگر بجلی کی فراہمی میں بھاری کٹوتی ہوگئی جب کہ تھرمل پاور نے پیداوار میں پہلے سے دوگنے کا اضافہ بھی کیا ہے۔

سنیل کے ساتھ ساتھ گوپال کو بھی احساس تھا کہ پوری بستی کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ بستی والوں کی چھوٹی موٹی کوشش کے بعد کوئی سر نہیں اٹھاتا۔ بستی میں اب کراسن تیل اور موم بتی کی کھپت زیادہ ہوگئی ہے۔ گرمی میں راتوں کو جب لوگ اپنی اپنی کابک میں سڑتے رہتے تو راتیں بیمار کی راتوں سے بھی بھاری ہوجاتیں۔ برسات میں تو سر شام گلیوں سڑکوں پر جس کے پاس ٹارچ نہیں ہوتا تو قدم قدم پر چھپاک —— آنکھوں کو بجلی کی روشنی کچھ اس طرح بھاگئی کہ دوسری کوئی روشنی کتابوں کے آگے جمنے نہیں دیتی۔ اس بستی کے تینوں ڈاکٹر ضعیف ہونے کو آئے۔ اس کے بعد کوئی میڈیکل نہ پڑھ سکا۔ سیول سروس میں بھی کوئی نہ رہا۔ نوین جی کے ریٹائر ہونے کو بھی ایک سال ہوگئے۔ روشنی —— زندگی کا استعارہ اور بجلی —— زندگی کا مفہوم۔ ایک امید ایسے میں تھرمل پاور سے بندھی تھی۔ فضاؤں میں خوشبو اِٹھلائی بھی۔ منڈیروں پر کبوتروں نے بے خوف ہوکر اپنے پنکھ سکھائے بھی۔ نئی سڑک بنی تو سائکل سے زیادہ بائک دندنانے لگی —— اب جو تھرمل پاور کی پوری بجلی بستی کو چھلانگ کر بھیجنے کی کارروائی پوری کی جارہی ہے۔ بستی اونگھنے لگی ہے۔ اندھے کے لئے دن اور رات میں کیا فرق ہوتا ہے۔ بستی کے لوگوں نے جب مطالبہ کیا تو ان کی آوازیں حلقوم سے نکل کر ان کے قدموں تلے ہی ڈھیر ہوگئیں۔ اور بچ گئی تو صرف جھنڈے اور بینر کے لہرانے کی جھمکتی یادیں۔

گوپال اور سنیل ایسے میں کچھ کرنے کا ارادہ لے کر پھر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک موقعہ ہاتھ آگیا تھا۔ راجدھانی کے کارندے آئے ہوئے تھے کارروائی آخری مرحلے میں

تھی۔ گو پال کو جاننے والا ایک افسر نکل آیا تھا۔ گو پال اس تک اپنی کہانیوں کے حوالے سے پہنچا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے بک اسٹال پر گو پال کو کسی نے مبارک بادی پیش کی تو بات آگے بڑھی تھی۔ راجدھانی کے کارندوں میں سے ایک افسر نے گو پال کو آگے بڑھ کر اس کی نئی کہانی پر اسی وقت ''کانگری چولیٹ'' کیا تھا۔ پھر چائے کی دعوت پر سامنے کے ہوٹل میں ایک گھنٹہ تک باتیں کرنے کا خوشگوار موقعہ ملا تھا۔ تعارف کے بعد گو پال نے باتوں ہی باتوں میں اس کے یہاں ہونے اور لوٹ کر جانے تک کا پورا پروگرام اور اس کی آمد کا مقصد جان لیا تھا۔ مگر بہت کچھ سوچ کر بھی اپنی بستی کے مسئلے کو وہ سامنے نہ لا سکا تھا۔ اس کو سنیل یاد آ گیا تھا—— سنیل اس کے بچپن کا ساتھی۔ باتوں میں گو پال اس سے کبھی نہیں جیتا لیکن اس کا قائل بھی کبھی نہ ہوا۔ اچانک ایسے میں اس کی ضرورت محسوس ہوگئی تھی اور اس نے پھر ملنے کا کہہ کر ہوٹل چھوڑا تھا۔ افسر نے بھی انتظار کرنے کی بات کی تھی۔

تھوڑی دیر کی خاموشی ان دونوں کے اٹھتے ہی ٹوٹی تھی او گو پال کو مخاطب کرتے ہوئے سنیل نے آگے قدم بڑھایا تھا۔

''گو پال...... واقعی ہم شمشان میں رہنے والوں کے بیچ ہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن تم کو پچھلے واقعات یاد نہیں؟''

''کیوں نہیں؟ اپنی اپنی دکان چمکانے کے لئے جھنڈے اور بینر سے بات آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔''

''ہونے کو تو ریلوے اسٹیشن کو میل اور سُپر فاسٹ کا اِسٹاپج ملا ہی۔ مگر اس وقت مل جاتا تو ہمیں یہ احساس ہوتا کہ ہماری آوازیں سنی جاتی ہیں۔''

''اب بھی ہماری آوازوں پر نہیں ہوا ہے۔ یہ تو تھرمل پاور کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''وہ بھی اس لئے کہ یہاں اتنے بڑے کوئلے کے بھنڈار کا پتہ چلا۔''

''چلو کسی بہانے ہی سہی۔''

''لیکن یار—— ہمیں کیا ملا؟''

''نہیں ہمیں بجلی ملے گی—— ملے گی کیوں نہیں——بستی کے لوگوں کی زمینیں بھی گئی ہیں۔رام دھن اور فضلو چاچا کے معاوضے کا معاملہ ابھی تک عدالت میں ہی ہے۔''

''یعنی کہ خون کے دھبے ابھی تازہ ہیں۔اور خون بہا...... پچھلے دنوں ہماری بات تھرمل پاور کے ایک اعلیٰ افسر سے ہوئی تھی۔وہ یہیں پلانٹ میں رہتا ہے۔کہہ رہا تھا کہ جلسے جلوس سے کچھ نہیں ہونے کو۔پیسہ بجلی کا کوئی یہاں دیتا نہیں ہے...... اچھا دیکھتے ہیں یہ بھی تو افسر ہے۔کوئی راستہ نکالے۔''

''لیکن جہاں تک پیسے دینے کی بات ہے——پیسہ دیتا کوئی نہیں ہے۔لینا پڑتا ہے۔نا کاروں نے ہر شعبے کو......''

باتیں کرتے کرتے یہ لوگ بستی سے دور نکل آئے تھے۔اب جو بڑی سڑک پر آئے تو کان پڑی آوازیں سنائی نہ دینے لگیں۔خاموش خاموش چلنے لگے۔پھر تھوڑے فاصلے کے بعد جب راستہ تبدیل کیا تو اک ذرا عافیت دیکھتے ہوئے گوپال نے بات پھر چھیڑی۔

''یار سنیل سرکار پیسہ نہیں وصول کرسکتی۔تو ہم ہی دے دیں۔ہم فائدہ اٹھائیں گے تو اس کا معاوضہ بھی دیں۔''

''ہمیں اس کے لئے تنظیم بنا کر کام کرنا ہوگا۔حالانکہ ماحول ایسا دکھائی نہیں دیتا۔ اب دیکھو نا۔پیسہ دینے کی بات تو الگ ہے۔بل بھی صحیح سے نہیں آتا۔اور لوگ بھی کھلے عام چوری سے بجلی جلا رہے ہیں۔دھڑلے سے جلا رہے ہیں۔''

''بڑے بڑے لوگ ہزاروں کی بجلی چُراتے ہیں اور لاکھوں بناتے ہیں۔''

''اتنا ہی نہیں گوپال۔یہ تو اب چھوت کی بیماری کی طرح پھیل گئی ہے۔دور کہاں جائیں۔اب تو ہر گھر میں بجلی چوری کی جل رہی ہے۔''

سنیل کے اتنا کہنے پر گوپال کی آنکھیں پھیل گئیں۔اس کو پوری بستی لچھمن جھولے کی طرح نظر آئی——بستی میں ہر بجلی کے پول سے جھولتے ہوئے لوگوں کے گھروں تک کھنچے تار——آنکڑوں کے مطابق تو بستی میں کل پچاس گھروں میں ہی بجلی ہے۔مگر پوری بستی میں

بجلی استعمال ہو رہی ہے۔ لوگوں نے گھر کے آگے سے گذرنے والے تار پر آسانی سے اپنا وائر لگا رکھا ہے۔ پچھلے ماہ جب بجلی چوری پر دھر پکڑ ابھیان چلا تھا۔ ہفتوں بستی تقریباً اندھیرے میں ڈوبی رہی تھی۔ سب نے جلدی جلدی اپنا تار سمیٹ لیا تھا۔ ایس۔ڈی۔او کے ساتھ تو تھانہ دار بھی آیا تھا۔ تھانہ دار بہت سخت آدمی ہے۔ مگر بجلی آفس کا مستری ایک دن پہلے آکر کہہ گیا تھا۔ تھانہ دار کی سختی کا کہیں پتا ہی نہ چلا۔ مستری نے تو بستی کے لوگوں سے وفاداری نبھائی تھی۔ اس کا کام نکلتا رہتا ہے۔ ان دنوں وہ بستی میں زیادہ ہی نظر آرہا تھا۔ چھوٹے موٹے کام کا اچھا پیسہ مل جاتا ہے۔ کھمبے پر چڑھنا پڑا تو پچاس روپے سے کم لیتا ہی نہیں۔ اگر کوئی کم پیسہ دینا چاہے تو باتیں بناتا ہے۔ علاقے سے وصولے ہوئے پیسے پر صرف اس کا ہی حق نہیں ہے۔ لوگ بھی اس کی باتوں کے قائل ہو جاتے ہیں۔ علاقے میں ایسے لوگ بھی ہیں۔ انگلیوں پر گنے چنے۔ جنہوں نے آج تک غلط بجلی نہیں استعمال کی اور نہ بل ہی جمع کرنے میں پیچھے رہتے۔ اب بھی نہیں جبکہ بجلی کی رسد ایک تہائی رہ گئی ہے۔ باقی لوگ اپنی بے نیازی میں مست ہیں — گوپال کو لگا وہ سڑک پر نہیں ہے۔ اپنے گھر میں ہے اور اچانک بجلی آگئی ہے اور جلتا ہوا ہیٹر اِسپات کی بھٹّی کی طرح دہک رہا ہے۔ چھت کی بھی کڑیوں پر لگا پنکھا، طوفان برپا کر رہا ہے اور باتھ روم میں گیزر کا پانی گھوں گھوں کر رہا ہے — گوپال نے اپنے آپ سے سوال کیا — ''کہاں جا رہے ہو؟'' تب اس نے محسوس کیا۔ زمین میں اس کے پاؤں دھنستے چلے جا رہے ہیں۔ اس نے کرتے کی جیب پر ہاتھ دھرا تو درخواست کے پلندے نے بھچر مچر کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ اس نے چاہا نکال کر دیکھے۔ لوگوں کے بے روح مطالبے۔ چوبیس گھنٹے بجلی کی فراہمی کی مانگ۔ اس نے سوچا اس میں تو صارفین کی تعداد سے زیادہ ایسے لوگوں کے دستخط ہیں جن کا حق ہی نہیں بنتا۔ ایسے میں اس کو اپنا وجود بھی لرزتا ہوا لگنے لگا۔ اس کی پیشانی پر ہواؤں کی لہروں سے کچھ ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ پیشانی پر پسینے اُمڑ آئے تھے۔ جسے دیکھ کر سنیل کے قدم رک گئے۔ اس نے دریافت کیا۔

''یار تم اتنا گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے گوپال نے فوراً کہا——

''گھبرائیں کیوں؟ دیکھا جائے گا۔ ہم تو آرزو منت ہی کرنے جارہے ہیں۔''
سنیل مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ کو مفہوم دینے کی کوشش میں گوپال نے خود سے سوال کیا—— کیا سنیل نے میری کیفیت پڑھ لی؟—— کیا یہ میرے گھر کا حال جانتا ہے؟——
سنیل بھی مجھ کو سبھوں جیسا سمجھ رہا ہے۔ تب اس کو یاد آیا۔ اس دن جب اس سے ملنے گیا تھا۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ اس کی موسی گرم کپڑوں کو دھوپ دکھا رہی تھی اور مزدور چاول کی بوریاں اتار رہے تھے۔ وہیں میدان میں دو کتے آپس میں ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ اور احاطے سے لگے ایک کنارے مزبلے پر پڑے سفید ڈھیر پر کالا کوا دائیں بائیں پھدک رہا تھا۔

سنیل کی پھوپی کم عمر میں ہی بیوہ ہوگئی تھی۔ اس کو میکے لوٹ آنا پڑا تھا۔ پھر اس نے ایک نئی زندگی کی شروعات کی۔ بڑی جدوجہد کے بعد وہ پرائمری اسکول کی ٹیچر بن گئی۔ اسکول محلے میں ہی تھا۔ جس کو بڑی تگ و دو کے بعد اپنے گھر لے آئی تھی۔ سرکاری عمارت اس اسکول کو میسر نہ تھی۔ جب اس نے اسکول کو اپنے گھر منتقل کرلیا تو پھر اسکول کہیں جا بھی نہ سکا۔ بچے تو گنتی کے دو چار ہی تھے۔ ٹیچر چار تھیں۔ سرکاری اسکول کے سارے تام جھام وہ بڑے سلیقے سے نبھاتی جارہی تھی۔ تھوڑی سی پریشانی جن گنا، بز واچن سُوچی اور پشو گنا کے وقت الجھن میں تبدیل ہوجایا کرتی۔ اسکول کا انسپکٹر مہینے دو مہینے میں ایک بار آتا۔ اس سے اوپر کا کبھی کوئی افسر نہیں آیا۔ بہار شکچھا پری یوجنا کی کمیٹی بھی بہ آسانی بن گئی۔ سنیل اس کمیٹی کا ادھیکچھ ہے۔ اس کی پھوپی اسکول کی ہڈ ہے۔ آدھے سے زیادہ ممبر تو گھر کے ہی ہیں۔ کمیٹی کے دیگر ممبران برائے نام ہیں۔ اک خبر یہ بھی ہے۔ سنیل کی پھوپی پری یوجنا کے کام کاج کے سلسلے میں ساحل پر پڑی پتھر ہے۔

سنیل کے گھر سے اس دن گوپال تو واپس آگیا تھا۔ چاول کی بوریاں اتارنے والے مزدوروں نے بتایا تھا کہ سنیل ڈی پی سی کے دفتر میں چاول دال کے ساتھ کھچڑی بنانے

کی اجرت کے لئے بیٹھا ہے۔

اتنی ساری باتوں کو سوچ کر گوپال کے چہرے پر اک ذرا مسکراہٹ کوند گئی۔ اس نے سوچا اگر سنیل مجھے بجلی کے استعمال پر کچھ بولا تو میں بھی اس سے آج حساب لے لوں گا۔ ڈھائی کیلو چاول اور ایک سو گرام دال کی در سے بچوں کی کھچڑی کا اناج۔ اسکول میں تو ایک بھی بچے نہیں۔ آخر چار بورے چاول ہر ماہ وہ کیا کرتا ہے۔ گوپال پر تولے ہوا تھا۔ اس نے سنیل کا چہرہ دیکھا وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اس پر ایک لمحہ نظر ٹھہری تو اس کی اپنی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔ چلتے چلتے پھر کچھ سوچ کر مسکرایا۔ اک ذرا رکا پھر اس نے تعجب سے کہا——

''یار سنیل—— تجھے کیا ہو گیا—— تو کیوں لنگڑا رہا ہے؟''

سنیل گوپال کی باتوں پر تھوڑا سنجیدہ ہوا پھر جھلا کر بولا۔

''اچھا—— اچھی کہی—— میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ تو پاؤں گھسیٹ کر چل رہا ہے۔ اور تو مجھے——''

قریب ہی سڑک کے کنارے نالے میں درخواست کے پلندے کا دو تہائی حصہ گندے پانی میں ڈوب چکا تھا۔

سلسلہ

راکھ ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ گنبدِ بے در کا نیلا رنگ لوٹنے لگا تھا۔ آسمانوں سے گرنے والی سرخی مائل گرد، گھروں سے جھاڑی جا رہی تھی۔ بعض نے گرد کو آنکھوں سے لگایا اور طاقوں پر رکھا۔ کچھ نے دل میں دفن کر اس پر کتبہ لگایا——سڑکوں پر لوگ آہستہ آہستہ نکل آئے تھے۔

وہ اپنے بھائی کی تلاش میں کسی ادارے کی مدد کے بغیر تنِ تنہا نکل پڑا تھا۔ بھائی کا ہر دم ہنستا رہنے والا چہرہ اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ البتہ سمت کا کوئی سراغ نہ تھا۔

سڑکوں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے ماحول میں دبکا ہوا خوف آ آ کر اس کا راستہ روک رہا تھا۔ وہ پھر بھی چلتا جا رہا تھا۔ اچانک سامنے کی گلی سے نکل کر ایک کتا زوردار آواز میں بھونکا۔ وہ کانپ گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم رک گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا کچھ نظر نہیں آیا۔ تب ہی جانی پہچانی آواز کا سوال دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔

''کہاں جارہے ہو؟''

''منّا کو ڈھونڈنے۔''

''مارے جاؤ گے۔''

''کیوں؟''

''کیوں! ہاہاہا.........ہاہا!!!''

''نہیں۔اب کیوں مارے جائیں گے؟ اب تو سب ہوگیا۔''

''کیا ہوگیا؟''

''لوگ جو چاہ رہے تھے۔''

''اس کے لئے تو تمہارا بھائی مارا گیا۔''

''تو پھر؟——اَب میں کیوں مارا جاؤں گا؟؟''

''تم !—— اَب تم کامیابی کی خوشی میں مارے جاؤ گے۔''

راشٹریہ سہارا - اگست ۱۹۹۴ء

دہلی

راشد انور راشد، قنبر علی کے افسانہ "بابا" پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں ---- "قنبر علی کا افسانہ انہیں کیفیات کو اجاگر کرتا ہے جس سے سماج کے دو طبقوں کے ذہنی شعور کی بدولت زندگی کے عجیب و غریب رویوں کی وضاحت ہوتی ہے۔"

مظہر الزماں خاں نے قنبر علی کے افسانہ "بجوکا" کو پڑھ کر لکھا --- "قنبر علی جتنی اچھی افسانوں پر نظر رکھتے ہیں، افسانے بھی اچھے لکھتے ہیں۔"

ہم یہ مانتے ہیں کہ یہ افسانے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر نہیں لکھے گئے۔ زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے عمل سے جو افسانے بنتے ہیں ان میں بیانیہ کی مصنوعی اور بین المتونی آرائش کا گذر نہیں ہوتا۔

قنبر علی کے افسانے ہماری دو تہائی آبادی کے روز و شب کا تخلیقی عکس و آئینہ ہے۔ جن میں نشیب و فراز کے دوش بدوش واقعات کے عیاں اور نہاں گوشوں کا لشکارا روح عصر کا پیدا کردہ ہے۔ ان کے دو ٹوک مکالمے سادہ واقعات اور نفسیاتی تہداری افسانے میں قاری کی شمولیت کا جواز پیدا کرتے ہیں۔

نشاط پبلی کیشن